عقائد الشیعت

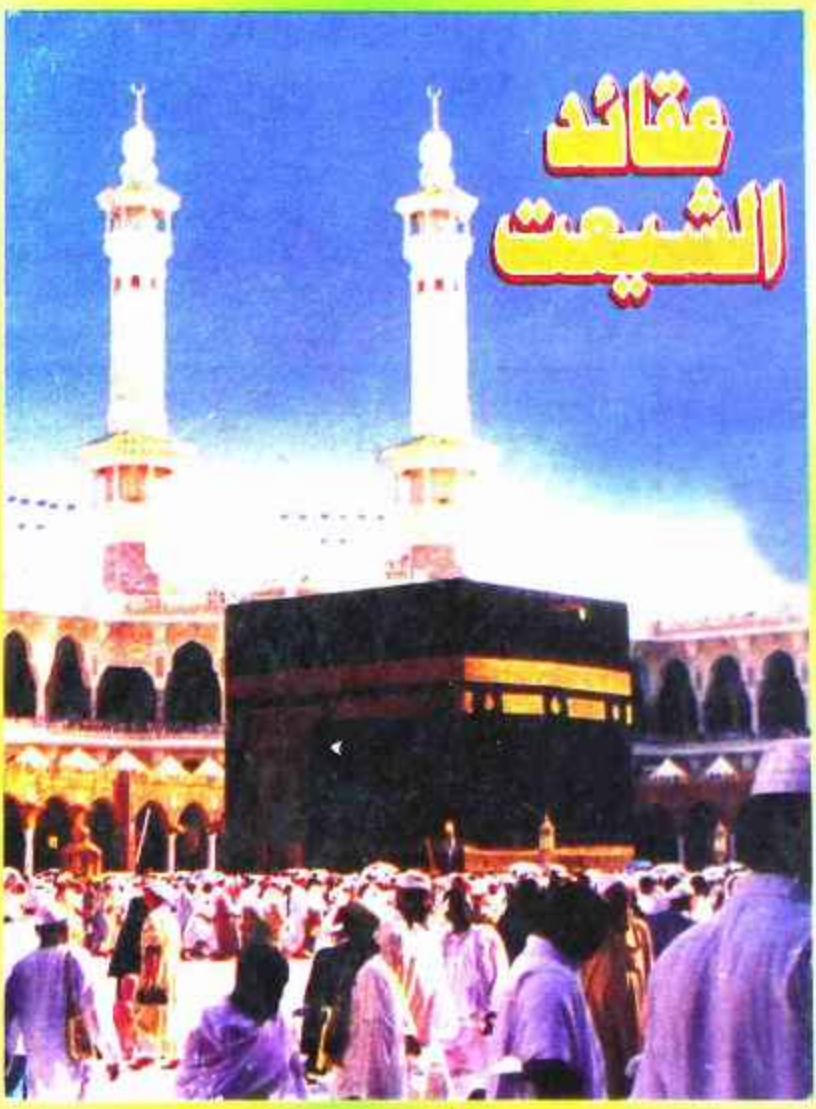

تالیف سخاوت علی شاہ موسوی الشیرازی

ناشر: مشن القائمؑ انٹرنیشنل

عقائد الشیعت

ناشر:

مرکز تحقیق صاحب الزمان (عج)

مشن القائم انٹرنیشنل

المہدی ہاؤس کراچی پاکستان

فون: 4398066-4395591

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

No. 13055 Date 5/4/11
Status
Section
D.D. Class
NAJAFI BOOK LIBRARY

توحید

(شیعہ نقطہ نگاہ)

حضرت علیؑ نے فرمایا ''میں گواہی دیتا ہوں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود (لائق عبادت) نہیں جو یکتا ہے، وحدہ لاشریک ہے۔ وہ اوّل ہے اسطرح کہ اس سے پہلے کوئی چیز نہیں اور آخر ہے یوں کہ اسکی کوئی انتہا نہیں''۔

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸۳)

نیز فرماتے ہیں ''وہی خدا اپنی اوّلیت کے سبب سے واجب (الوجود) ہے کہ اس سے پہلے کوئی نہ اور اسکے آخر ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ اسکے بعد کوئی نہ ہو''۔ (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۹۹)

پھر فرماتے ہیں ''جو کہے اسکی بھی سنتا ہے، جو چپ رہے اسکے بھید کو بھی وہ خوب جانتا ہے۔ جو زندہ ہے اسکا رزق اسکے ذمہ ہے۔ اور جو مر جائے اس کا پلٹانا اسی کے ذمہ ہے''۔ (نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۰۷)

''وہ ایسا سخی ہے کہ تمام سوالوں کا پورا کرنا اسکو مفلس نہیں بنا سکتا اور گڑ گڑا کر سوال کرنے والوں کا اصرار اسکو بخل پر آمادہ نہیں کر سکتا''۔

(نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۸۹)

NAJAFI BOOK LIBRARY
Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI
PH. 7211795

بحث توحید

سوال نمبرا: وہ خالق ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ اس نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو اے حبیب تم کو خلق کیا تا کہ بندوں پر کرم اور انسان کامل بنا سکے۔ درج ذیل حدیث کی وضاحت فرمائیں اور اس کے ضمن میں یہ بھی واضح کریں کہ وحدت الوجود کے قائل افراد اس سے کیا استدلال کرتے ہیں اور ان کا جواب کیا ہے؟

داخل فی الا شیاء لا کشی داخل فی الشی و خارج من الا شیاء لا کشی خارج من شی "وہ اشیاء میں داخل ہے لیکن جیسے ایک شے دوسری شے میں داخل ہوتی ہے وہ اس طرح سے داخل نہیں ہے اور وہ اشیاء سے خارج ہے لیکن جس طرح سے کوئی شے کسی شے سے خارج ہوتی ہے وہ اس طرح خارج نہیں ہے۔

جواب: سوال میں حدیث کا جو ٹکڑا بیان کیا گیا ہے یہ امیر المومنین علیہ السلام کی حدیث کا مختصر اقتباس ہے اصول کافی میں اس حدیث کو امیر المومنین کی سند سے نقل کیا گیا اس حدیث میں حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے حق تعالیٰ کی تعریف بیان فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ذات حق جسم وجسمانیات کے اوصاف واحوال سے پاک ومنزہ ہے اور مکمل حدیث یہ ہے:

سئل امیر المؤمنین علیه السلام بم عرفت ربک فقال بماعرفنی نفسه قیل و کیف عرفک نفسه قال :لا یشبهه صورة ولا یحس بالحواس ولا یقاس بالناس قریب فی بعده بیعدفی قربه فوق کل شی ولا یقال شیء فوقه امام کل شی ولایقال له امام داخل فی الا شیاء لا کشی داخل فی شی وخارج من الا شیاء لا کشی خارج من شی سبحان من هو هکذا ولا هکذاغیره ولکل شیء مبتدء (اصول کافی ج ا۔ص ۸۶)

ترجمہ :امیر المومنین علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے پروردگار کو کس چیز سے پہچانا؟ آپ نے فرمایا میں نے اسے پہچانا جیسا کہ اس نے اپنی ذات کی مجھے خود پہچان کرائی۔ کہا گیا کہ ذات حق نے اپنی پہچان آپ کو کس طرح کرائی؟ آپ نے فرمایا اللہ نے مجھے اپنی پہچان یوں کرائی کہ کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے اور حواس کے ذریعے سے اسے محسوس نہیں کیا جاسکتا اور اس کا قیاس انسانوں پر نہیں کیا جاسکتا۔ یعنی وہ جسم نہیں ہے اور وہ مخلوق کے قریب ہے اور وہ ذات وصفات کے اعتبار سے تمام ممکنات سے بعید ہے اور عقول واوہام وافہام کے احاطہ سے بہت دور ہے اسی کی وجہ سے قائم ہیں ذات حق کو قدرت وغلبہ وکمال کے اعتبار سے ہر چیز پر فوقیت حاصل ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ کوئی

چیز اس کے اوپر ہے۔(واضح رہے کہ لفظ ''فوق'' بالحاظ مکان نہیں بلکہ رتبہ وکمال کے اعتبار سے ہے) داخل فی الاشیاء کائنات کی کوئی چیز اور اجزائے عالم میں سے کوئی بھی اس کے تصرف وتدبیر اور ذات حق کے حضور علمی وجود سے خالی نہیں ہے۔''لا کشی داخل فی الشیء'' وہ اس طرح سے داخل نہیں ہے جیسے ایک جزا پنی کل میں داخل ہوتا ہے جیسا کہ گھی دودھ میں داخل ہوتا ہے اور وہ اس طرح سے بھی داخل نہیں ہے جیسے عارض معروض میں داخل ہوتا ہے اور وہ کسی مکان میں متمکن کی طرح سے بھی اشیاء میں داخل نہیں ہے یا جیسا کہ کوئی تخت پر بیٹھا ہوا ہو وہ یوں بھی نہیں ہے یا جس طرح حرارت پانی میں داخل ہوتی ہے وہ اس طرح سے بھی اشیاء میں داخل نہیں ہے کیونکہ دخول کی مذکورہ تینوں اقسام کا تعلق جسم وجسمانیات کے اوصاف سے ہے اور ذات حق ان اوصاف سے پاک وپاکیزہ ہے۔

''لا کشیء خارج من شیء'' یعنی اس کے خروج کی وہ کیفیت ہرگز نہیں ہے جو اشیاء کے بعد مکانی ومحلی کے خروج کی ہوتی ہے۔بالجملہ معیت قیومیت الٰہیہ کائنات کی تمام اشیاء کے ساتھ ہے اور اسکے شدت قرب اور احاطہ کلیہ کی شبیہ ونظیر نہیں ہے۔اسی لئے اشیائے عالم سے اسکی مباینت کی بھی کوئی شبیہ ونظیر نہیں ہے۔

البتہ ذہن کے قریب کرنے کے لئے اس کی مثال کے لئے روح اور نفس ناطقہ کی مثال بعض وجوہ سے بیان کی جاسکتی ہے کیونکہ نفس اجزائے بدن میں سے ہر جزو کا متصرف اور مدبر ہے مگر اس کے باوجود کسی خاص جزو سے اسے منسوب کرنا درست نہیں ہے اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ روح اس میں قیام پذیر ہے یقیناً روح تمام بدن میں موجود ہے اور بدن سے باہر بھی موجود ہے۔ مگر اس کے دخول وخروج کا وہ انداز ہرگز نہیں ہے جو کہ اجسام کے دخول وخروج کا ہوتا ہے جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔

اور روح کے متعلق یہ کہنا درست ہے کہ وہ تصرف واحاطہ کے اعتبار سے بدن کے قریب ہے لیکن اس کے باوجود وہ مقام ذات کی حیثیت اور عوارض بدنی کے اعتبار سے بدن سے دور ہے۔

واضح رہے کہ حق تعالیٰ کی دوری اور نزدیکی کی بھی وہی حیثیت ہے جو روح کی بدن کے دوری ونزدیک ہونے کی ہے اور جب انسان روح کے قرب وبعد کی ماہیت وحقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے تو وہ ذات حق کے قرب وبعد کی کیفیت کو سمجھنے سے عاجز ترین ہے۔ اسی لئے کاشف اسرار حق امیر المومنینؑ نے نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں کیا ہی خوبصورت الفاظ ارشاد فرمائے:

الذی لا یدر که بعد الهمم و لا یناله غوص الفطن ''ذات حق

کونہ بلند پرواز ہمتیں پاسکتی ہیں اور نہ عقل وفہم کی گہرائیاں اس کی تہ تک پہنچ سکتی ہیں۔"1

عقیدۃ وحدت الوجود رکھنے والوں کا موقف

سوال کے ضمن میں وحدت الوجود کے نظریے کے متعلق پوچھا گیا ہے تو حقیقت یہ ہے کہ لفظ "وحدت الوجود" کی کئی تعبیریں کی گئی ہیں اور ان میں سے

1۔اور اس عدم رسائی کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی مکمل حقیقت وماہیت اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اس چیز پر برتری اور احاطہ حاصل ہو اور یہ بات بڑی واضح ہے کہ مخلوق کو خالق پر برتری اور احاطہ حاصل نہیں ہے اسی لئے مخلوق اس کی حقیقت کے ادراک سے عاجز ہے۔اگر کوئی انسان یہ تصور کرلے کہ وہ ذات حق کی حقیق کو سمجھ چکا ہے تو وہ امر محال کا دعویدار قرار پائے گا۔جبکہ یہاں تو ذوات عالیہ ہمیں یہ یہاں کمال معرفت یہ ہے کہ انسان اپنی عاجزی کا اقرار کرلے کہ میں ذات حق کی معرفت سے قاصر ہوں۔اصول کافی میں امام محمد باقر کا فرمان ہے: **تکلموا فی خلق اللہ و لا تتکلموا فی اللہ فان الکلام فی اللہ لا یزداد صاحبہ الا تحیرا** (الکافی ج۱۔ص۹۲) "خلق خدا کے متعلق گفتگو کرو اور ذات خدا کے متعلق گفتگو نہ کرو کیونکہ یہ گفتگو اپنے متکلم کی حیرانی وسرگردانی میں اضافہ کرے گی۔

اور دوسری روایت میں اس حقیقت کو ان الفاظ سے واضح کیا گیا:

من نظر فی اللہ کیف ھو ھلک "جس نے اللہ کے متعلق یہ غور وخوض کیا کہ وہ کیسا ہے اس کی کیفیت کیا ہے تو وہ ہلاک ہوگیا۔" اس لئے ذات حق کی کیفیت اور اس کے قرب وبعد کی کیفیت کے متعلق.

مشہور تعبیر تو یہ ہے کہ حقیقی وجود ذات حق کا ہے اور باقی تمام وجود اس کی نمائش وتجلی ہیں اور نظریے کے قائل افراد وجود کی وحدت وکثرت کی مثال سمندر اور اس سے اٹھنے والی لہروں سے دیتے ہیں اور اہل عقل کے نزدیک یہ تعبیر انتہائی غلط ہے کیونکہ کوئی بھی عقلمند یہ ماننے پر ہرگز آمادہ نہیں ہوسکتا کہ تمام موجودات نظر وفکر کا واہمہ ہیں اور وجود بس ایک ہی ہے اور سمندر کی موجوں اور حباب کی یہ خود ساختہ مثالیں ذات احدیت کے حضور بے باکی کا کھلم کھلا مظاہرہ ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

لیس کمثلہ شیء ،سبحان ربک رب العزۃ عما یصفون

''خدا کی مثل کوئی چیز نہیں ہے۔تیز ارب العزت ان کے وصف سے کہیں پاک وپاکیزہ ہے۔'' (سورۃ صافات آیت ۱۸۰)

(گزشتہ سے پیوستہ)

غور وخوض کا نتیجہ حیرانی وسرگردانی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔اسکے بجائے ہمیں ذات حق کی لامحدود قدرت وحکمت کے متعلق غور وخوض کرنا چاہئے جو کہ کائنات کے ذرہ ذرہ میں دکھائی دیتی ہے۔اس لئے کہ:

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار

اسی لئے مشہور مرجع عالی قدر حضرت آیت اللہ محسن الحکیم رضوان اللہ علیہ نے عروۃ الوثقیٰ کی شرح میں وحدت الوجود کے اقوال بیان کرنے کے بعد لکھا:

حسن الظن بھؤلاء القائلین بالتوحید انخاص ظاھرھا والا فکیف یصح علی ھزہ القوال وجود الخالق والمخلوق والا مر والمامود والراحم والمر حوم. (المستمسک ج ا۔ص ۳۹۱)

ہر درقش دفتریست معرفت کردگار

یعنی درختوں کا ہر پتہ معرفت کردگار کا ایک دفتر ہے۔

اس کے ساتھ انسان کو اپنی عاجزی وناتوانی مدنظر رکھنی چاہئے اور انسان کو چاہئے کہ اپنی معمولی سی ہستی کا وسیع وعریض کائنات سے موازنہ کرے، پھر اسے معلوم ہوگا کہ اس کی حیثیت سمندر کے مقابلے میں ایک قطرہ آب سے بھی کم ہے اور جب اسے اپنی بے بضاعتی کا یقین ہو جائے تو پھر اسے سوچنا چاہئے کہ جس طرح سے اس کی حیثیت کائنات کے مقابلے میں کچھ نہیں ہے۔ اسی طرح اس وسیع وعریض کائنات کی حیثیت قدرت خداوندی کے سامنے کچھ نہیں ہے اور ایک حقیر ذرے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ اتنی بڑی کائنات کے خالق ومالک کی حقیقت وماہیت کے متعلق غور وخوض کرتا پھرے۔ اس کیلئے سلامتی کا فقط یہی راستہ ہے کہ اپنی عاجزی وناتوانی کا اظہار کرے اور اپنے چھوٹے اور کمزور ذہن پر اتنا بڑا بوجھ نہ ڈالے۔

شریعت طاہرہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم ہر مسلمان کے متعلق حسن ظن رکھیں اور اس کے ساتھ شریعت نے ہمیں یہ حکم بھی دیا ہے کہ مسلمان کی بات کو

اور صحیح ترین مفہوم پر محمول کریں ان دونوں اسباب کے تحت وحدت الوجود کے اقوال کی ہمیں صحیح تاویل کرنی ہوگی ورنہ وحدت الوجود کے قائلین کے ظاہری الفاظ انتہا یہ غلط ہیں کیونکہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خالق بھی وہی ہو اور مخلوق بھی وہی ہو اور حاکم بھی وہی ہو اور محکوم بھی وہی۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

کمزور سے ذہن پر اتنا بڑا بوجھ گز نہ ڈالے۔

جس محفل میں سورج بھی ذرہ نظر آتا ہو وہاں اپنے آپ کو میانہ قرار دینا خلاف ادب ہے۔

بعض کم عقل کہتے ہیں کہ جب خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا اور اس کی حقیقت کو سمجھا بھی نہیں جا سکتا تو آخر ہم کیسے مان لیں کہ وہ موجود ہے؟

اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ انسان آج تک حقیقت حیات کو سمجھ نہیں سکا۔ انسان حیات کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ بس اس کے آثار کا ہی مشاہدہ کر سکتا ہے تو کیا ہمیں حیات کا انکار کر دینا چاہئے؟ اسی طرح سے آج تک انسان روح کی حقیقت کو نہیں سمجھ پایا تو کیا اس عاجزی کی وجہ سے روح کا انکار کر دینا چاہئے؟

اور ہم ایسے ہی خود ساختہ ''بقراطوں'' سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آیا وہ عقل رکھتے ہیں یا نہیں ؟ اگر وہ کہیں کہ وہ عقل رکھتے ہیں تو ہم کہیں گے کہ کیا تم نے عقل دیکھی ہے

اور رحم کرنے والا بھی وہی ہو اور جس پر رحم کیا جا رہا ہے وہ بھی وہی ہو۔ غرضیکہ یہ جملے شریعت طاہرہ کے منافی ہیں۔

ہم ان لوگوں کے متعلق بس یہی کہہ سکتے ہیں: وما قدروا اللہ حق قدرہ.

(سورۃ انعام آیت ۹۱)۔

یعنی جو کچھ اہل عقل نے کہا وہ اس سے پاک ہے اور جو کچھ غافلوں نے کہا وہ اس سے پاک تر ہے۔

(گزشتہ سے پیوستہ)

اور کیا تم عقل کی حقیقت و ماہیت کو جانتے ہو؟ جب تم نے عقل کو دیکھا ہی نہیں اور اس کی حقیقت و ماہیت سے بھی واقف نہیں ہو تو اپنے لئے عقل کا دعویٰ کیوں کرتے ہو اور اس کی نفی کیوں نہیں کرتے ؟ اگر اس سوال کے جواب میں وہ یہ کہیں کہ ہم عقل نہیں رکھتے تو ایسے عقل دشمنوں سے بحث ہی فضول ہے۔

سارا جہاں اس کی الوہیت پر متفق ہے اور اس کی کنہ ماہیت سے عاجز ہے۔ اس کی کنہ ذات تک ادراک کی رسائی نہیں اور اس کے صفات کی تہ تک فکر کی پرواز نہیں ہے۔ طائر فکر اس کے اوج ذات تک پرواز کرنے سے قاصر ہے اور دست فہم اس کے اوصاف کے دامن کو پکڑنے سے عاجز ہے۔ جن خاص افراد نے اس راہ میں اپنے گھوڑے دوڑائے ہیں وہ بھی تھک ہار کر واپس آئے ہیں۔

دوَر و تسلسل کا بطلان

سوال ۲ ''دوَر'' اور ''تسلسل'' کا بطلان واضح فرمائیں؟

جواب ''دوَر'' کی تعریف یہ ہے کہ ''وقوف الشیء علی نفسه'' ایک چیز اپنی ذات پر ہی متوقف ہو خواہ وہ توقف اسی چیز پر ہو یا بالواسطہ ہو اور فلاسفہ و علم معقول کی اصطلاح میں دوَر عبارت ہے کہ دو امر ایک دوسرے پر متوقف ہوں جس کے نتیجے کے طور پر کوئی چیز اپنی ہی ذات پر متوقف نظر آئے اور پھر دوَر کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ دوَر مصرح: کہ دو امر ایک دوسرے پر متوقف ہوں۔ مثلاً یہ کہا جائے کہ ''الف'' کے وجود کا سبب ''با'' ہے اور ''با'' کے وجود کا سبب ''الف'' ہے۔ اور یوں ''الف'' اور ''با'' کو توقف خود اسکی ذات پر لازم آئیگا جو کہ بالبداہت باطل ہے

(گزشتہ سے پیوستہ)

علاوہ ازیں کچھ دیگر حکمائے اسلام نے وحدت الوجود کے لفظ کی اور توجیہات بھی کی ہیں اور انہوں نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس سے وہ وحدت مراد ہے جس کے مختلف مراتب کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی علت اور معلول قرار پاتے ہیں اور یہ چیز غیر ممکن ہے کہ ایک چیز اپنی ہی علت ہو اور اس علت کی خود ہی معلوم ہو کیونکہ جب ہم یہ کہیں گیکہ ''الف، با'' پر موقوف ہے تو اسکا مقصد یہ ہے کہ ''با، الف'' پر موقوف

ہے تو اس صورت میں ''الف'' علت قرار پائے اور ''با'' اسکا معمول بن جائیگا اور یہ چیز باطل ہے۔

تسلسل کی تعریف

تسلسل سے مراد یہ ہے کہ ایک چیز دوسری پر موقوف ہو اور دوسری تیسری پر موقوف ہو اور تیسری چوتھی پر موقوف ہو اور یوں ان کی کوئی انتہا نہ ہو اور سلسلہ ممکنات کہیں بھی اختتام پذیر نہ ہو۔ تسلسل بھی عقلاء کے نزدیک باطل ہے۔ اسی لئے ضرورت ہے کہ ہم سلسلہ ممکنات کے اختتام کو تسلیم کریں اور علت العلل کا

ہیں۔ جیسا کہ لفظ نور حقیقت واحدہ ہے لیکن قوت وضعف کے اعتبار سے اس کے مختلف مراتب ہیں اور اسی طرح سے لفظ وجود کے بھی مختلف مراتب ہیں۔ کبھی وجود، واجب الوجود ہوتا ہے کبھی وجود ی بالذات اور عالم بالذات کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی وجود ممکن اور حادث کی شکل میں ہوتا ہے اور یوں عالم بالغیر اور قادر بالغیر ہوتا ہے اور پھر ممکنات میں بھی وجود کے بہت سے مراتب ہوتے ہیں اس کے علاوہ کچھ دیگر حکماء نے اس لفظ کی کچھ اور انداز سے تشریح وتوضیح کی ہے جن کا ذکر طول کلام کا موجب ہے۔ اسی لئے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہیں۔

اقرار کریں جو کہ بالذات واجب الوجود ہے۔

دور اور تسلسل کے بطلان کے لئے آپ اس مثال پر غور فرمائیں: گندم کی پیداوار گندم کے بیج پر موقوف ہے اور مرغی کا وجود انڈے پر موقوف ہے سادہ

الفاظ میں اس سوال کو یوں دہرایا جاسکتا ہے کہ انڈہ پہلے ہے یا مرغی پہلے ہے اور اسی طرح سے گندم کا بیج پہلے ہے یا گندم پہلے ہے یا آم کی گٹھلی پہلے ہے یا آم پہلے ہے؟ اگر ہم یہ کہنا شروع کریں کہ مرغی انڈے پر موقوف ہے اور انڈہ مرغی پر موقوف ہے تو یہ دور ہوگا جو کہ باطل ہے اور اگر ہم یہ کہیں یہ مرغی پر موقوف ہے تو یہ دور ہوگا جو کہ باطل ہے اور اگر ہم کہیں یہ مرغی فلاں انڈے سے پیدا ہوئی اور وہ انڈہ فلاں مرغی سے پیدا ہوا اور یوں اس سلسلے کو طویل کرتے جائیں اور اس کی حد آخر مقرر نہ کریں تو یہ تسلسل ہوگا اور تسلسل بھی محال ہے۔ اس کا آخری حل یہی ہے کہ ہم یہ عقیدہ رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے مرغی کو پیدا کیا تھا جس سے انڈہ پیدا ہوا اور اس انڈے سے مزید مرغیوں کی نسل جاری ہوئی۔ اسی طرح سے ہم یہ تسلیم کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے آم کے پیڑ کو پیدا کیا جس پر آم لگے اور اس سے گٹھلیاں وجود میں آئیں اور وہ گٹھلیاں آم کی افزائش نسل کا ذریعہ ثابت ہوئیں جب تک ہم علت العلل اور واجب الوجود پر ایمان نہ لائیں گے اس وقت تک ہم دور اور تسلسل سے نجات حاصل نہیں کرسکیں گے۔

حضرت موسیٰؑ نے دیدار کا سوال کیوں کیا؟

سوال ۳ قرآن مجید کی آیت ہے:

ولما جاء موسی لمیقاتنا و کلمه ربه قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی ولکن انظر الی الجبل فان استقر مکانه فسوف ترانی

فلما تجلی ربه للجبل جعله دکا وخر موسی صعقا فلما افاق قال سبحانک الیک وانا اول المؤمنین ۔ (الاعراف ۱۴۳)

''اور جب موسیٰؑ ہمارا وعدہ پورا کرنے آئے اور ان کے رب نے ان سے کلام کیا تو انہوں نے کہا کہ پروردگار مجھے اپنا جلوہ دکھادے۔ ارشاد ہوا کہ تم ہرگز مجھے نہیں دیکھ سکتے البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر یہ اپنی جگہ قائم رہ گیا تو پھر مجھے دیکھ سکتے ہو۔ اسکے بعد جب پہاڑ پر پروردگار کی تجلی ہوئی تو پہاڑ چور چور ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ پھر جب انہیں ہوش آیا تو کہنے لگے کہ پروردگار تو پاک و پاکیزہ ہے میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں درج بالا آیت کو پیش نظر رکھ کر مامون الرشید نے امام علی رضاؑ سے پوچھا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اولوالعزم رسول تھے اور وہ جانتے تھے کہ خدا دیکھنے کی چیز نہیں ہے اس کے باوجود انہوں نے دیدار کی خواہش کیوں کی تھی؟

اس کے جواب میں امام علی رضاؑ نے جو توجیہات پیش کر کے اسے مطمئن کیا تھا وہ جواب بیان فرمائیں۔

جواب امام علی رضاؑ کا جواب کتاب عیون الا خبار الرضا میں مرقوم ہے۔ آپ نے مامون کے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا:

واقعہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو معلوم تھا کہ ذات احدیت قابل مشاہدہ

نہیں ہے لیکن جب اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا اور انہیں اپنا مقرب بنایا تو انہوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ اللہ نے ان سے کلام کیا ہے۔

بنی اسرائیل نے کہا: جب تک ہم خود اللہ کا کلام نہ سن لیں اس وقت تک آپ کی تائید نہیں کریں گے۔

اس کے بعد آپ نے سات لاکھ افراد میں سے ستر ہزار افراد کا انتخاب کیا اور ستر ہزار میں سے (۷۰) ستر کو کوہ طور پر لے گئے اور انہیں دامن کوہ پر ٹھہرایا اور خود طور کی چوٹی پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنا کلام سنائے۔

اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے گفتگو کی جسے ان تمام لوگوں نے اوپر، نیچے اور دائیں، بائیں سے سنا۔

اور جب وہ اللہ کا کلام سن چکے تو انہوں نے کہا: ہم آپ پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک ہم اپنے پروردگار کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں بہتر اسمجھایا کہ ذات خداوندی کو دیکھنا محال ہے مگر وہ جاہل اپنی ضد پر اڑے رہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا یہ نامعقول مطالبہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے موسیٰ! میں نے ان لوگوں کی گفتگو سن لی ہے۔ تم

ان کا مطالبہ مجھ تک بلا خوف وخطر پہنچاؤ میں تمہارا کوئی مواخذہ نہیں کروں گا۔

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیدار کا مطالبہ کیا تو اللہ نے فرمایا: تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے۔

اور جب اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات میں سے ایک آیت کا پہاڑ پر جلوہ دکھایا تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہوگئے جب ہوش میں آئے تو کہا: خدایا! تو پاک ہے۔ میں تیرے حضور اپنے سابقہ عقیدہ کی طرف رجوع کرتا ہوں کہ تو قابل رؤیت نہیں ہے اور اپنی قوم کی جہالت کے لئے توجہ کرتا ہوں اور تیرے غیر مرئی ہونے پر میں سب سے پہلے ایمان لانے والا ہوں۔

مامون نے حضرت کا یہ جواب سن کر کہا تھا: ابوالحسن! اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے آپ نے میری تشویش کو دور کر دیا ہے۔

عدل (شیعہ نقطہ نگاہ)

شیعہ مذہب میں اصول دین کا دوسرا اہم ترین عقیدہ عدل ہے یعنی خداوند عالم سو فیصد عادل ہے اور وہ مکمل عدالت کے ساتھ جزا و سزا دے گا۔ اور کسی پر ظلم نہ کرے گا۔ آیت اللہ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے لکھا کہ عدل کے معنی ہر چیز کو اسکے موزوں ترین مقام پر رکھنا اور حق دار کو پورا کرنا۔ عدل ہی سے

آسمان وزمین قائم ہیں ۔کیونکہ عادل حکیم نے میزان عدل ہی سے انکو ایجاد فرمایا ہے۔اسکے برخلاف ظلم قیامت کی تاریکی ہے۔اللہ نے خود عدل واحسان کا حکم دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ عدل تقویٰ سے سب سے زیادہ قریب ہے (الدین الاسلام ص ۱۶۸)

قرآن مجید میں خداوند عالم نے خود فرمایا ہے کہ ''اللہ اپنے غلاموں پر ہر گز ظلم نہیں کرتا''۔(القرآن)

خدا تو رحمٰن ورحیم ہے بلکہ ارحم الراحمین ہے۔ایسی ذات سے ظلم کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔نیز خدا کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اور ظلم سے بڑا کوئی عیب نہیں۔اسلئے خداوند عالم کیلئے ظلم کرنے کا تصور بھی نا قابل تصور ہے۔ رہا یہ کہنا کہ خدا کو کون عدل کرنے پر مجبور کرسکتا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ خدا نے خود اپنے اوپر رحم کو واجب قرار دیا ہے (القرآن) اب جو اپنے اوپر رحمت کو واجب قرار دے لے اور خود کو رحمٰن ورحیم فرمائے، گویا اس نے خود اپنے اوپر عدل کو بھی واجب کرلیا۔یا کم سے کم ظلم نہ کرنے کو واجب کرلیا۔اسی لئے فرمایا:

''جو ذرہ کے وزن کے برابر بھی اچھا عمل کرے گا، وہ اسکو دیکھے گا اور جو ذرہ کے وزن کے برابر بُرا عمل کریگا، وہ اس کو دیکھے گا''۔(القرآن)

سوال نمبر۱ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ومکرواو مکر اللہ واللہ خیر الما کرین.(آل عمران ۵۴)

''اورانہوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ بہتر مکر کرنے والا ہے۔''

اس آیت مجیدہ کے ضمن میں واضح فرمائیں کہ انسانی مکر اور خدائی مکر میں کیا فرق ہے؟

جواب: جب کسی بندے کے لئے مکر کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے فریب اور دھوکہ مراد ہوتا ہے جو وہ اپنے غلط مقصد کے حصول کے لئے بجالاتا ہے۔

جب لفظ مکر کا اطلاق اللہ تعالیٰ کے لئے کیا جائے تو اس سے اس کی ایک مخصوص قسم عقوبت وانتقام مراد ہوتی ہے جو وہ اپنے بدکردار بندوں کو دیتا ہے۔

مکر الٰہی اس سزا اور عقوبت کو کہا جاتا ہے جو اس انداز سے بندہ پر وار ہو کہ بندہ کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ اللہ کے غضب کا نشانہ بن چکا ہے۔

قرآن مجید کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مکر الٰہی دو طرح کا ہوتا ہے: ایک ڈھیل دینا اور دوسرا استدراج۔

ا۔ ڈھیل دینا:

اللہ تعالیٰ بعض اوقات کفار اور بدکار افراد کو ڈھیل دے دیتا ہے تا کہ وہ دل کھول کر گناہ کرلیں اور پھر گناہوں کی وجہ سے ان کا مواخذہ کرتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

ولا یحسبن الذین کفروا انما نملی لھم خیر لا نفسھم انما نملی لھم لیز دادوا ثماولھم عذاب مھین۔ (آل عمران ۱۷۸)

''اور خبردار کفار یہ نہ سمجھیں کہ ہم جس قدر انہیں ڈھیل دے رہے ہیں وہ ان کے حق میں کوئی بھلائی ہے۔ ہم تو صرف اس لئے انہیں ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ مزید گناہ کرلیں اور ان کے لئے رسوا کن عذاب ہے۔''

امام علی رضا علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: واللہ ما عذبھم اللہ بشیء اشد من الا ملاء ''یعنی خدا کی قسم ڈھیل دینے سے بڑھ کر اللہ نے انہیں زیادہ سزا نہیں دی۔

مقصد یہ ہے کہ ڈھیل دینا اللہ کا سخت ترین عذاب ہے تا کہ اس ڈھیل کی وجہ سے ان کے گناہ زیادہ ہو جائیں اور وہ زیادہ سے زیادہ سزا کے مستحق قرار پائیں۔

۲۔ استدراج

کبھی مکر الٰہی استدراج کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور استدراج کا مقصد یہ ہے کہ بندہ کی طرف سے جس قدر گناہوں میں اضافہ ہو خدا کی طرف سے اتنا ہی نعمتوں میں اضافہ ہو اور اضافہ نعمت کی وجہ سے انسان توبہ و استغفار کی طرف متوجہ نہ ہو۔ امام جعفر صادق علیہ السلام کا فرمان ہے۔

ازا اراد اللہ بعبد خیرا فاذنب ذنبا اتبعہ بنقمۃ ویذ کرہ الا

ستغفار واذا اراد الله بعبد شرا فاذنب ذنبا اتبعه نبعمة لينسيه الا ستغفار ويتمادی به وهو قوله تعالی سنستدر جهم من حيث لا ی علمون.

"یعنی جب اللہ تعالی کو کسی بندے کی بھلائی مطلوب ہوتی ہے اور ایسا بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے تو اللہ تعالی فوراً اسے کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتا ہے اور اسے استغفار کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ اس کے برخلاف جب اللہ کو کسی بندے کی برائی مطلوب ہوتی ہے اور ایسا بندہ گناہ کرتا ہے تو اللہ اس پر اپنی نعمت نازل کر دیتا ہے تا کہ وہ استغفار کی جانب متوجہ نہ ہو سکے اور اللہ تعالی نے اس آیت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے: سنستدرجھم من حیث لا یعلمون واملی لھم ان کیدی متین .(سورہ اعراف ۱۸۲_۱۸۳)" ہم انہیں اس طرح لپیٹ لیں گے کہ انہیں معلوم بھی نہ ہوگا اور میں تو انہیں ڈھیل دے رہا ہوں کہ میری تدبیر بہت مستحکم ہوتی ہے۔"

عقوبت الٰہی کی دونوں قسموں یعنی ڈھیل دینے اور استدراج کو مکر کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سزا اس مکر کے مشابہ ہوتی ہے جو بندے ایک دوسرے سے کیا کرتے ہیں لیکن واضح رہے کہ یہ سزا جو کہ یقیناً عدل وانصاف کے تقاضوں پر مبنی ہوتی ہے شکل وصورت کی وجہ سے مکر دکھائی دیتی ہے لیکن غرض ومقصد کے اعتبار سے ہرگز دھوکہ دہی پر مبنی نہیں ہوتی۔

بندوں کے مکر اور رحمانی مکر میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ انسان کا مکر کبھی کامیاب ہوتا ہے اور کبھی ناکام ہوتا ہے لیکن مکر الٰہی یعنی رحمانی تدبیر کبھی بھی ناکامی سے دوچار نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی تدبیر و مکر کے متعلق فرمایا ہے:

۱۔ واللہ خیر الماکرین. (آل عمران ۵۴) ''اللہ بہترین مکر (تدبیر) کرنے والا ہے۔''

۲۔ واذا اذقنا الناس رحمة من بعد ضراء مستهم اذا لهم مکر فی ایاتنا قل الله اسرع مکرا ان رسلنا یکتبون ماتمکرون. (یونس ۲۱) ''اور جب تکلیف پہنچنے کے بعد ہم نے لوگوں کو ذرا رحمت کا مزہ چکھا دیا تو فوراً ہماری آیتوں میں مکاری کرنے لگے تو آپ کہہ دیجئے کہ خدا تم سے تیز تر مکر (تدبیر) کرنے والا ہے اور ہمارے نمائندے تمہارے مکر کو برابر لکھ رہے ہیں۔''

۳۔ واملی لهم ان کیدی متین. (الاعراف ۱۸۳) ''میں تو انہیں ڈھیل دے رہا ہوں، یقیناً میری تدبیر بہت مستحکم ہوتی ہے۔''

عقوبت الٰہی کو لفظ مکر سے تعبیر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ کی یہ عقوبت بندہ کے مکر کے جواب میں نازل ہوتی ہے اسی لئے اسے بھی لفظ مکر سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی مثال کیلئے اس آیت مجیدہ کے الفاظ پر خصوصی توجہ فرمائیں: وجزآء سیئة سیئة مثلها. (الشوریٰ ۴۰) ''برائی کا بدلہ اس جیسی ہی برائی ہے۔''

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ بدلہ میں جو برائی کی جائے گی وہ عین عدل ہوگی،

حقیقتاً برائی نہیں ہوگی۔ مگر لفظی طور پر اسے برائی سے تعبیر کرنا درست ہے اور یہ لفظ صحیح ہیں کہ بدی کا بدلہ بدی ہے تو اس قاعدے کے تحت مکر کے بدلے کو بھی لفظ مکر سے تعبیر کیا گیا ہے جبکہ وہ مکر مذموم نہیں بلکہ عین عدل ہے نے تعبیر کیا ہے۔''

ولا یحیق المکر السیء الا باھلہ.(فاطر۴۳)''بری چالیں چالباز کو ہی اپنے گھرے میں لے لیتی ہیں اسباب مکر وصیلہ جب چارہ جوئی اور مخفی سے کام لینے سے عبارت ہو تو اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں: اچھی تدبیر اور بری تدبیر۔ اچھی تدبیر وہ ہے جسے جائز منفعت کے لئے صحیح طریقہ سے استعمال میں لایا جائے اور اپنے آپ کو یا کسی دوسرے کو دشمن کے شر سے محفوظ رکھا جائے اور ایسی تدبیر جس کا طریقہ بھی درست ہو اور جس کا ہدف بھی صحیح ہو یقیناً قابل تعریف ہوتی ہے اور اس تدبیر کو مکر رحمانی سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے برعکس بری تدبیر وہ ہے جس میں ناجائز ذرائع استعمال کر کے کسی کو ناحق تنگ کیا جائے اور اس کا مقصد صرف اذیت پسندی ہو اور ایسی تدبیر کو قرآن مجید میں ابلیسی مکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

رحمانی تدبیر ہر لحاظ سے صحیح اور قابل مدح ہوتی ہے اور اس کا مقصد ابلیس اور اس کے پیروکاروں کے منصوبوں کو خاک میں ملانا ہوتا ہے اور ان کی مکر کی بازی کو ان پر پلٹنا ہوتا ہے تا کہ ابلیس اور اس کے پیروکار رسوا ہوں اور دین سے وابستہ افراد کامیاب و کامران ہوں۔

آسان لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مکر دراصل شیطان کی طرف سے

ہوتا ہے اور اس کے جواب میں خدائی تدبیر وقوع پذیر ہوتی جسے جزا اور طریقہ کار کی وجہ سے لفظ مکر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مکر الٰہی کی کیفیت ونوعیت کی وضاحت کے لئے ہم قرآن مجید میں سے دو مثالیں بیان کرتے ہیں تا کہ ہمارے قارئین کو بخوبی معلوم ہو سکے کہ مکر الٰہی خدا کی طرف سے کوئی دھوکہ اور چالبازی نہیں بلکہ کفار کی چالبازی کا جواب ہے۔

مکر الٰہی پہلی مثال

ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین. (آل عمران ۵۴)

''اور انہوں نے مکر کیا اور اللہ نے مکر کیا اور اللہ بہترین مکر کرنے والا ہے۔

اس آیت مجیدہ کا تعلق حضرت مسیح علیہ السلام کے واقعے سے ہے حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد کا نام یہودا تھا جو کہ دلی طور پر منافق تھا اور اس نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے خلاف سازش کی تھی کہ انہیں گرفتار کرا کے پھانسی دلا دی جائے۔ جب وہ یہودیوں کو اس مکان تک لے آیا جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام موجود تھے اور اس نے یہودیوں سے کہا کہ تم یہاں رک جاؤ میں اندر جا کر عیسٰی علیہ السلام کو باہر لاؤں گا پھر تم انہیں گرفتار کر لینا اور پھر صلیب پہ چڑھا دینا۔ چنانچہ جب وہ گھر میں داخل ہو تو خدا نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو آسمان پر اٹھا لیا اور یہودا کو ان کی شبیہ بنا دیا۔ لوگوں نے

اسے گرفتار کرلیا اور وہ فریاد کرتا رہا کہ میں تمہارا دوست یہودا ہوں عیسیٰ نہیں ہوں لیکن لوگوں نے اس کی بات کو تسلیم نہ کیا اور اس کو سولی پر چڑھا دیا گیا اور جب وہ سولی پر مر گیا تو اللہ نے اس کو اس کی اصلی شکل پر پلٹا دیا اور یوں خدائی انتقام واضح ہوگیا۔ یقیناً خدا ہر ظالم کے مکر کو اس کی طرف پلٹا دیتا ہے اور حق کی اس طرح سے نصرت کرتا ہے جس کے متعلق اہل باطل سوچ بھی نہیں سکتے۔

واقعہ ہجرت مکر الٰہی کی دوسری مثال

واذ یمکربک الذین کفروا لیثبتوک اویقتلوک اویخرجوک ویمکوون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین.(انفال۳۰)

"اور پیغمبر! آپ اس وقت کو یاد کریں جب کفار تدبیریں کرتے تھے کہ آپ کو قید کرلیں یا شہر بدر کردیں یا قتل کردیں اور ان کی تدبیروں کے خلاف خدا بھی ان کے خلاف انتظام کررہا تھا اور وہ بہترین انتظام کرنے والا ہے۔"

اہل مدینہ کے اسلام قبول کرنے پر کفار مکہ میں کھلبلی مچ گئی اور انہوں نے "ندوہ" میں اپنا اجلاس کیا۔

ابوالبختری نے تجویز پیش کی کہ محمدؐ کو قید کردیا جائے اور روزانہ اسے کھانا پانی دیتے رہنا چاہئے اور اسے قید سے نہیں نکالنا چاہئے یہاں تک کہ وہ ہماری مخالفت ترک کردے یا اسے موت آجائے۔

شیخ مجدی نے کہا: یہ تجویز بالکل نامعقول ہے کیونکہ بنی ہاشم اسے زندان سے رہا کرالیں گے۔

ہشام بن عمرو نے کہا: میری تجویز یہ ہے کہ اسے ایک اونٹ پر باندھ دیا جائے اور اونٹ کو کسی صحرا میں چھوڑ دیا جائے جہاں وہ بھوک اور پیاس سے مرجائے۔

شیخ مجدی نے کہا: یہ تجویز نامعقول ہے کیونکہ کوئی نہ کوئی عرب اسے رسیوں سے آزاد کردیگا اور وہ محمدؐ کو اپنے قوم قبیلہ میں لے جائے گا اور جب محمدؐ باہر پہنچ گیا تو عربی قبائل کو اپنا ہمنوا بنالے گا اور تھوڑے عرصے بعد مکہ پر یورش کردیگا۔

ابوجہل نے کہا: میری تجویز یہ ہے کہ مکہ کے تمام قبائل کے چیدہ افراد مل کر محمدؐ پر حملہ کریں اور اسے قتل کردیں اور اس طرح سے بنی ہاشم انتقام نہ لے سکیں گے۔

شیخ مجدی نے یہ تجویز سن کر ابوجہل کو داد دی اور کہا: یہ دانشمندانہ تجویز ہے تمہیں اس پر عمل کرنا چاہئے۔

بعض ادویات میں ہے کہ ابلیس لعین نے جو کہ ندوہ کے اجتماع میں شیخ مجدی کے روپ میں موجود تھا، اس نے ہی یہ تجویز پیش کی تھی جسے تمام کافر

سربراہوں نے سراہا اور اس منصوبہ کے تحت مکہ کے تمام قبائل میں سے افراد کا انتخاب کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو کفار کے منصوبہ سے آگاہ کیا۔

حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر سلایا اور خود ہجرت کی اور غار ثور میں پہنچ گئے۔

خون کے پیاسے ساری رات ننگی تلواریں لے کر گھر کو گھیرے میں لئے کھڑے رہے اور جب وہ رات کے آخری حصے میں دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے اور چادر ہٹائی تو بستر پر حضرت علیؑ تھے۔

کافروں نے پوچھا: محمدؐ کہاں ہیں؟ شیر خدا نے فرمایا: کیا تم میرے حوالے کر گئے تھے کہ اب وصول کرنے آ گئے ہو؟

غرض کہ شرمندہ ہو کر باہر آئے۔ پھر انہوں نے ایک سراخ رساں کھوجی کی خدمات حاصل کیں اور وہ آنحضرت کے نقش قدم کو دیکھتے ہوئے غار ثور تک انہیں لے آیا۔ ادھر قدرت نے اپنے حبیب کی حفاظت کے لئے یہ انتظام کر دیا تھا کہ غار کے منہ پر مکڑی نے جالا تنا ہوا تھا اور کبوتری نے انڈے دیئے ہوئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر انہوں نے کہا کہ اگر محمدؐ یہاں آئے ہوتے تو مکڑی کا یہ جالا یوں تنا ہوا نہ ہوتا اور یہ کبوتری یوں بے خوفی سے یہاں انڈے نہ دیتی۔

نبوت

(شیعہ نقطہ نگاہ)

خدا نے اپنے ذمہ اپنی مخلوق کی ہدایت کی ذمہ داری لی ہے۔ کیونکہ وہ عادل ہے اور عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ ہدایت کرے کیونکہ ہدایت کے بغیر سزا و جزاء باطل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے خداوند عالم نے فرمایا ولکل قوم ھاد ''ہر قوم کیلئے ایک ھادی ضرور ہوتا ہے۔'' (القرآن)

عملاً بھی خدا نے ہر قوم کیلئے ایک نہ ایک ھادی ضرور بھیجا۔ حتیٰ کہ اوّل انسان حضرت آدم خدا کے نبی تھے اور آخری نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ آپؐ کے بعد جو بھی نبی ہونے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا۔

شیخ صدوقؒ نے لکھا ''تمام انبیاء کرامؑ حق کے ساتھ، خدائے برحق کی جانب سے تشریف لائے۔ ان کا قول خدا قول، انکا حکم خدا کا حکم ہے۔ اسلئے انکی اطاعت خدا کی اطاعت ہے اور انکی نافرمانی، خدا کی نافرمانی ہے۔ تمام انبیاء کرامؑ میں نے کسی نے بھی خدا کی وحی اور خدا کے حکم کے علاوہ کوئی حکم خود اپنی طرف سے نہیں دیا۔ تام انبیاء کرامؑ میں سے پانچ ایسے نبی ہیں جو تمام انبیاء کرامؑ کے سردار ہیں۔ جن پر وہی کا دارومدار ہے۔ وہی الوالعزم پیغمبرؑ ہیں اور صاحب شریعت رسول ہیں۔ وہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت

عیسیٰ ؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ ہیں۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ سب سے افضل ہیں۔ سب کے سردار ہیں۔ ہم تمام انبیاء کرام کو اس لئے مانتے ہیں کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے انکی تصدیق فرمائی ہے"۔ (اعتقادیہ شیخ صدوق متوفی ۳۸۱ھ)

یہ سوچ کر بے نیل و مرام واپس چلے آئے اور یوں اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تدبیر کو اپنے تعبیر کیا۔

ان واقعات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہود و مشرکین کے منصوبہ مکر شیطانی کے مظہر تھے جب کہ خدائی تدبیر عین عدل پر مبنی تھی۔

بحث نبوت

کیا آبائے پیغمبر موحد تھے؟

سوال نمبر ۱: زیارت امام حسین علیہ السلام میں ہم یہ الفاظ کہتے ہیں:

اشهد انک کنت نورا فی الا صلاب الشامخة "میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بلند و برتر اور شریف اصلاب میں بصورت نور متمکن تھے۔"

اس جملے کی رو سے سوال یہ ہے کہ کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام آباء و اجداد موحد تھے اور کیا آبائے پیغمبر حضرت موسیٰ ؑ پر ایمان لائے تھے اور کیا وہ حضرت عیسیٰ ؑ کے دین پر ایمان لائے تھے؟

اگر بالفرض وہ حضرت عیسیٰ ؑ کی نبوت پر ایمان لائے تھے تو اس قاعدے

کی رو سے حضرت عبدالمطلب اور ان کے بزرگ عیسائی ہوں گے اور اگر حضرت پیغمبر کے بزرگ حضرت ابراہیمؑ کی ملت پر کاربند تھے تو انہوں نے حضرت موسیٰؑ وعیسیٰ کے دین کی پیروی کیوں نہیں کی تھی اور حضرت حمزہ سید الشہداء کے متعلق تو کتابوں میں ہمیں یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ وہ اسلام لانے سے قبل مشرک تھے۔ تو کیا یہ بات صحیح ہے؟ آپ اس مسئلے کی تسلی بخش وضاحت فرمائیں۔

جواب: فرقہ امامیہ کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ حضرت آدم تک آنحضرت کے جملہ آباء واجداد موحد تھے۔

علامہ مجلسی رحمتہ اللہ علیہ نے حیات القلوب کی جلد دوم کی تیسری فصل میں لکھا ہے کہ علمائے امامیہ کا اس امر پر اجماع ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جملہ آباء اور امہات حضرت عبداللہ سے لے کر حضرت آدمؑ تک اور حضرت آمنہ سے لے کر حضرت حوا تک سب کے سب موحد اور مومن تھے۔ پیغمبر اکرم کا نور کسی مشرک کے صلب اور کسی مشرک کے رحم میں نہیں رہا اور آنحضرت کے تمام تر بزرگ نکاح سے پیدا ہوئے اور ان میں سے کوئی بھی بدکاری کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوا تھا۔

عامہ وخاصہ منقول روایات متواترہ اسی مضمون پر نہ صرف دلالت کرتی ہیں بلکہ احادیث متواترہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت کے تمام بزرگ

انبیاء واوصیاء تھے اور وہ سب کے سب دین خداوندی کے حامل تھے۔

آنحضرت سے لے کر حضرت اسماعیل تک آپ کے جتنے بھی آبادواجداد تھے وہ سب کے سب حضرت ابراہیم کے وصی تھے اور مکہ کی بادشاہی اور تولیت حرم ہمیشہ انہی کے پاس رہی تھی اور وہ ہمیشہ اپنے دور میں مرجع خلق تھے اور وہ ملت ابراہیم کے پیروکار تھے اور وہ اس شریعت کے نگہبان تھے اور ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے تھے اور انبیاء کے تبرکات وآثار کے امین تھے اور وہ ان تبرکات کو ایک دوسرے کے سپرد کرتے رہے۔ یہاں تک کہ تبرکات انبیاء حضرت عبدالمطلب کو منتقل ہوئے اور عبدالمطلب نے حضرت ابوطالب کو اپنا وصی مقرر کیا اور انبیائے سابقین کے تبرکات وآثار ان کے حوالے کئے اور جب حضرت محمد مصطفیٰؐ مبعوث بہ نبوت ہوئے تو حضرت ابوطالبؑ نے وہ تبرکات آپ کے حوالے کئے تھے۔

حضرت ابراہیمؑ واسماعیلؑ کی وصایت کا سلسلہ حضرت عبدالمطلب پر منتہی ہوا پھر یہ سلسلہ حضرت ابو طالبؑ کے ذریعے سے حضرت محمد مصطفیٰؐ تک پہنچا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اوصیائے ابراہیم کی دو شاخیں تھیں۔ ایک شاخ اولاد اسحاق کی تھی جس میں انبیائے بنی اسرائیل شامل تھے اور دوسری شاخ اولاد اسماعیل پر مشتمل تھی جن میں آنحضرت کے آبائے کرام شامل تھے اور

وہ سب کے سب ملت ابراہیم کے پیروکار تھے اسی شریعت کے نگہبان تھے اور وہ انبیائے بنی اسرائیل کی امت نہیں تھے۔ (کیونکہ حضرت موسیٰ وعیسٰی علیہ السلام دونوں صرف بنی اسرائیل کے نبی تھے۔ انہوں نے بنی اسرائیل کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنی شریعت کی دعوت ہی نہیں دی تھی)۔

علامہ مجلسی کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عبدالمطلب اور حضرت ابوطالب، حضرت موسیٰ وعیسٰی علیہا السلام کی شریعتوں کے مکلف نہیں تھے۔ دونوں بزرگوار حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اوصیاء تھے اور حجت پروردگار تھے۔

علامہ مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ۳۵ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا: **یبعث الله عبدالمطلب یوم القیامة وعلیه سیمآء الا بنیاء وبهاء الملوک**. "اللہ تعالیٰ عبدالمطلب کو قیامت کے دن انبیاء کے چہرے اور شاہانہ شوکت کے ساتھ مبعوث کرے گا۔"

شیخ صدوق رحمتہ علیہ اپنے اعتقادیہ میں رقم طراز ہیں:

وقدروی ان عبدالمطلب کان حجة وابا طالب کان وصیه. (اعتقادات صدوق ص ۸۵۔ باب ۴۰)

روایت کی گئی ہے کہ عبدالمطلب حجت تھے اور ابوطالب ان کے وصی

تھے۔طبرسیؒ نے کتاب اعلام الوریٰ میں حضرت حمزہ کے قبول اسلام کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور ان کی فضیلت میں وارد احادیث کو نقل کیا اور اسلام اور رسولؐ اسلام کے لئے ان کی جانثاری کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔

معجزات پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سوال نمبر۲ سورۃ بنی اسرائیل کی ان آیات کی تلاوت فرمائیں:

وقالوا لن نؤمن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا اوتکون ل جنة من نخیل وعنب فتفجر الا نهار خللها تفجیرا اوتسقط السمآء کماز عمت علینا کسفا اوتاتی بالله والملائکة قبیلا اویکون لک بیت من زخرف اوترقی فی السمآء ولن نؤمن لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقرؤه قل سبحان ربی هل کنت الا بشرا رسولا. (بنی اسرائیل ۹۰تا۹۳)

اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم تم پر ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین سے چشمہ جاری نہ کردو، یا تمہارے پاس کھجور اور انگور کے باغ ہوں جن کے درمیان تم نہریں جاری کردو، یا ہمارے اوپر اپنے خیال کے مطابق آسمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرادو، یا اللہ اور ملائکہ کو ہمارے سامنے لاکر کھڑا کردو، یا تمہارے پاس سونے کا کوئی مکان ہو، یا تم آسمان کی بلندی پر چڑھ جاؤ اور اس

بلندی پر بھی ہم ایمان نہ لائیں گے جب تک کوئی ایسی کتاب نازل نہ کردو جسے ہم پڑھ لیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ہمارا پروردگار بڑا بے نیاز ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں جسے رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔"

معجزہ کے منکرین درج بالا آیات پیش کر کے استدلال کرتے ہیں کہ اہل مکہ نے آنحضرت سے درج بالا معجزات طلب کئے تھے اور آنحضرت نے ان معجزات کے اظہار سے اپنی عاجزی کا اظہار کیا تھا۔ ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت نے سرے سے کوئی مادی معجزہ پیش ہی نہیں کیا تھا۔

آپ سے درخواست ہے کہ آیات بالا کا شان نزول اور معجزہ کے اظہار کے متعلق تسلی بخش جواب دیں۔

ا۔ واضح رہے کہ جب علمائے امامیہ آبائے پیغمبر اکرم کے موحد ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا مقصود صرف حضور اکرم کے خالص باپ دادا ہوتے ہیں۔ ان کا مقصود دیگر خاندان نہیں ہوتا۔ مثلاً ہم حضرت عبداللہ کو موحد اور مومن مانتے ہیں لیکن ابولہب کو موحد تسلیم نہیں کرتے۔ ہم صرف ان اصلاب وارحام کو مومن وموحد مانتے ہیں جہاں آنحضرت کا نور مرتکز رہا تھا۔ ان کے علاوہ ان کے تمام رشتہ داروں کے مومن وموحد ہونے کا ہم عقیدہ نہیں رکھتے۔ اسی لئے اگر حضرت حمزہؓ کے مشرک ہونے کی روایات صحیح بھی ہوں تو بھی ہمارے موقف پر کوئی زد نہیں۔

(من المترجم عفی عنه)"

جواب جو شخص خدا کی طرف سے نبوت ورسالت کا دعویدار ہو تو اس کے لئے عقلاً واجب ہے کہ وہ اپنی صداقت کو خارق عادت امر سے ثابت کرے۔

اگر نبوت ورسالت کا دعویدار جھوٹا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر معجزہ ظاہر نہیں کرے گا اور اگر سچا ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی صداقت کے اظہار کے لئے معجزہ ظاہر کرے گا۔ کسی نبی کی نبوت کے اثبات کے لئے معجزہ ہی کافی ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ نبی ہر شخص کی اناپ شناپ فرمائش پر معجزے دکھانا شروع کردے کیونکہ اگر نبی ایسا کرنے لگ جائے تو عالم تکوین درہم برہم ہو جائے اور جغرافیائی حدود بدلنے کے لئے مبعوث نہیں کیا۔

آیات بالا کے متعلق عرض یہ ہے کہ جن لوگوں نے آنحضرت سے طرفہ معجزات طلب کئے تھے وہ دراصل ایمان لانا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف اپنے مادی فوائد کے حصول کے خواہش مند تھے اور مقام نبوت کا مذاق اڑانا چاہتے تھے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے مطالبہ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ علاوہ ازیں معجزہ کے متعلق یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیئے کہ معجزہ اس خارق امر کو کہا جاتا ہے جو عادتاً محال ہو۔ معجزہ وہ نہیں ہوتا جو عقلاً محال ہو۔ اس تمہید کے بعد ہم اصل سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

۱۔ کفار مکہ کے ان مطالبات کو خدا اور رسولؐ نے کوئی اہمیت اس لئے نہیں دی تھی کیونکہ مذکورہ معجزات کا مطالبہ کرنے والے افراد وہ تھے جو ہمیشہ آنحضرت کو اذیت دیا کرتے تھے اور مطالبہ سے پہلے بھی وہ آپ کی نبوت کے دسیوں معجزات دیکھ چکے تھے مگر ہر معجزہ ان کے مزید انکار و سرکشی کا موجب ثابت ہوا تھا۔

اگر مذکورہ افراد ایمان لانے کے خواہش مند ہوتے تو ان کے لئے صداقت محمدؐ کا ایک معجزہ قرآن مجید ہی کافی تھا۔ مگر قرآن جیسے معجزے کو دیکھ کر بھی وہ ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں وہ شق القمر جیسا عظیم معجزہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے مگر انہوں نے شق القمر کا معجزہ دیکھ کر کہا تھا کہ یہ ''سحر مستمر'' ہے یعنی محمدؐ سے اس طرح کے عجائبات کا تو ہمیشہ ظہور ہوا ہی کرتا ہے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

مذکورہ معجزات طلب کرنے والے افراد ہرگز ایمان لانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ صرف بہانے بازی اور مقام نبوت کے استہزاء کے لئے ایسے بے سروپا امور کا مطالبہ کرتے آئے تھے۔ اسی لئے ان کے مطالبات کو اللہ نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔

۲۔ ان کے طرفہ مطالبات میں کچھ امور ایسے بھی تھے جو کہ عقلاً محال تھے کیونکہ انہوں نے اپنے مطالبات کے ضمن میں یہ کہا تھا کہ تم خدا اور ملائکہ کو

ہمارے سامنے لے آؤ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ کو دیکھنا عقلاً محال ہے کیونکہ اللہ جسم وجسمانیات سے پاک ہے۔

۳۔ علاوہ ازیں اپنے مطالبات کے ضمن میں وضع تکوینی کو زیروزبر کرنا چاہتے تھے کیونکہ ان لوگوں نے کہا تھا: مکہ کے پہاڑوں کو ہٹا کر ہموار میدان بنادو، پھر زمین سے چشمہ جاری کرو اور تمہارے باغات ہونے چاہئیں جن کے پھلوں کو ہم جی بھر کر کھائیں۔ پھر ہم ایمان لائیں گے۔

دراصل یہ مطالبہ انتہائی عامیانہ قسم کا تھا (کیونکہ دنیا میں لاکھوں انسانوں کے پاس باغات موجود ہیں تو کیا باغات کے مالک ہونے کی وجہ سے وہ نبی بن گئے ہیں؟ معلوم ہوا کہ باغ کی ملکیت اور منصب نبوت کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ مترجم) انہوں نے یہ مطالبہ محض دشمنی اور جھگڑے کے لئے کیا تھا۔

امامت

خدا کے حکم پر حضرت محمدؐ نے اپنے بارہ جانشین مقرر فرمائے جو بارہ امام ہیں اور رسول خدا کے خلیفہ برحق ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جابر بن سمرہؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے پیغمبر خدا کو ارشاد فرماتے سنا کہ میرے بعد بارہ حاکم ہوں گے۔ اسکے بعد آپؐ نے کوئی فقرہ فرمایا جو میں سن نہ سکا۔ میرے باپ نے کہا پیغمبرؐ نے فرمایا وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے (شرح بخاری جلد ۹ ص ۲۶۶ تاج کمپنی)

امام ابوداؤد نے سنن ابوداؤد میں لکھا کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ''جب تک تم لوگوں پر بارہ خلیفہ رہیں گے، اس وقت تک یہ دین قائم رہے گا''۔

(سنن ابی داؤد جلد ۳ ص ۳۱۸)

امام ترمذی نے لکھا کہ رسولؐ خدا نے فرمایا ''میرے بعد بارہ سردار ہوں گے، وہ سب قریش سے ہوں گے''۔ (جامع ترمذی جلد ا ص ۸۱۳)

اب یہ بارہ رسولؐ کے خلیفہ یا امام کون ہیں؟ مذہب شیعہ کے نزدیک اہلبیتؑ کے بارہ امام ہیں، جنکے اول حضرت علیؑ ہیں اور بارہویں امام مہدیؑ ہیں

اہلسنت اب بارہ اماموں کے تعین میں پریشان

علام ابن خلدون نے لکھا ''پہلے چار خلفائے کے بعد امام حسنؑ پانچویں خلیفہ ہیں۔ معاویہ چھٹے ہیں۔ ساتویں عمر ابن عبد العزیز ہیں۔ باقی پانچ خلفاء اہلبیت میں سے اولاد علیؑ میں سے ہوں گے (مقدمہ ابن خلدون جلد ۲ ص ۸۱۳)

علامہ جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا

''رسول اللہؐ نے جن بارہ خلفاء کی بابت اشارہ فرمایا ہے ان کے نام یہ ہیں۔ چار خلفائے راشدین، امام حسنؑ، معاویہ، ابن زبیر، عمر ابن عبد العزیز آٹھ ہوئے۔ انہیں میں المھدی کو بھی شامل کرنا چاہیئے کیونکہ عہد عباسی میں یہ ویسے ہی انصاف شعار عادل ہوئے جیسے بنی امیہ میں عمر ابن عبد العزیز۔ اس دس کے بعد

دو خلفاء منتظر باقی رہے۔ جن میں ایک امام مہدیؑ ہوں گے جو اہلبیتؑ سے ہوں گے"۔ تاریخ الخلفاء ص ۲۸)

مولانا وحید الزماں صدیقی مصنف لغات الحدیث نے حضرت علیؑ سے لے کر امام مہدیؑ تک ائمہ اہلبیتؑ کے بارہ نام لکھے اور پھر لکھا یہی بارہ امام ہمارے بھی امام ہیں۔ یہی امراء ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ منتھی ہوتی ہے۔ انہیں کی طرف خلافت رسولؐ اور ریاست دین متعین۔ یہی لوگ آفتاب آسمان یقین ہیں۔

(ھدیۃ المھدی ص ۱۰۲ بحوالہ عقل وتہذیب اہل حدیث ص ۱۲۲)

ائمہ اہلبیتؑ کا تعارف کتب اہلسنت سے حضرت علیؑ

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ حضرت علیؑ بچپن ہی سے رسول خداؐ کی گود میں اور تربیت میں پلے اور اور جس قدر آنحضرت (حضرت علیؑ) کو رسول خدا کے اقوال و افعال سے مطلع ہونے کا موقع ملا تھا، کسی کو نہیں ملا۔ ایک شخص نے حضرت علیؑ سے پوچھا کہ آپ اس قدر زیادہ کثرت سے کیوں روایات و احادیث بیان کر سکتے ہیں، دوسرے صحابہ کرام کے مقابلے میں؟ فرمایا" جناب رسولؐ خدا ابتداء کیا کرتے تھے"۔ اسکے ساتھ ساتھ آپؑ کی ذہانت اور قوت استنباط اور ملکہ استخراج ایسا بڑھا ہوا تھا کہ عموماً صحابہ اعتراف کرتے تھے۔ حضرت عمرؓ کا عام قول تھا کہ خدا نہ کرے کہ کوئی مشکل مسئلہ آن پڑے اور علیؑ موجود نہ ہوں۔ عبداللہ ابن عباسؓ بھی

اگر چہ خود مجتہد تھے مگر کہا کرتے تھے کہ جب ہمیں علیؑ کا فتویٰ مل جائے تو پھر کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔ (سیرت نعمان صد ۳۱۳ شائع کردہ اسلامی اداکامی لاہور)

محقق علامہ عباس محمود العقاد مصری لکھتے ہیں کہ ''حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ و عثمانؓ کے زمانے میں خود ان حضرات اور دوسرے صحابہ کیلئے حضرت علیؑ کے فتاویٰ نظائر (مثالی) حیثیت رکھتے تھے۔ شریعت کا شاید ہی کوئی مسئلہ ہو جس میں حضرت علیؑ کی کوئی واضح رائے (ہدایت) موجود نہ ہو''۔ (علی شخصیت و کردار ص ۴۳ مولف عباس محمد العقاد مصری ترجمہ مہناج الدین اصلاحی شائع کردہ بستان لاہور)

صحابہ کرامؓ میں صرف حضرت علیؑ ہی کی یہ شان تھی کہ فرمایا کرتے تھے ''اللہ کی قسم قرآن میں کوئی ایک ایسی آیت نازل نہیں ہوئی، مگر یہ کہ اس کے بارے میں جانتا ہوں کہ وہ آیت کس کی شان میں، کب اور کہاں اتری۔ بے شک میرے رب نے مجھے سوچنے سمجھنے والا دل، فصیح البیان زبان عطا فرمائی ہے۔ (علیؑ ابن ابی طالب المفتی القاضی مصنف مصری عالم محقق عبدالستار آدم ص ۳۶ ترجمہ محمد ناصر قاسمی مطبوعہ لاہور)

سوال یہ ہے کہ

حضرت علیؑ سب سے بڑے عالم قاضی محدّث تھے مگر بخاری شریف ۸ میں صرف ۱۹ حدیثیں ان سے لی گئیں اور مسلم شریف میں صرف ۲۰ حدیثیں لی گئیں۔ باقی احادیث کہاں چلی گئیں۔ یہ سوال اہلسنت بھائیوں کو حل کرنا چاہیئے

کہ کس طرح خلفاء بنی امیہ، بنی عباس نے علم دین کو ضائع کیا اور امت کو اس علم سے محروم کر دیا جو حضرت علیؑ کے ذریعہ امت کو ملا۔ اور آج آئمہ اہلبیتؑ کے بیانات کی شکل میں موجود ہے۔

امام حسنؑ و امام حسینؑ

اہلبیتؑ کے دوسرے اور تیسرے امام ہیں۔ جن کے بارے میں رسول خداؐ نے فرمایا ''حسنؑ و حسینؑ جنت کے جوانوں کے سردار ہیں''۔ (بخاری)

نیز فرمایا ''حسنؑ و حسینؑ دونوں امام ہیں خواہ جنگ کیلئے کھڑے ہوں یا صلح کر کے بیٹھ جائیں''۔ (ترمذی شریف)

امام زین العابدینؑ

عظیم مصری محقق ابوزہرہ مصری لکھتے ہیں کہ امام زہری نے فرمایا ''میں نے علی ابن الحسین زین العابدینؑ سے زیادہ فقیہ کسی کو نہیں پایا۔

(حضرت امام جعفر صادق فقہ و اجتہاد ص ۲۲۰ مولف ابوزہرہ مصری مطبوعہ لاہور)

سارا عالم اسلام آپ کو امام امت مانتا تھا۔ ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں ''تمام دینی شخصیتوں مُن سب سے با اثر و محبوب شخصیت حضرت علیؑ ابن الحسینؑ (زین العابدینؑ) کی تھی جو اپنی عبادت تقویٰ زہد و ورع میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے تمام مسلمانوں کو ان سے تعلق تھا اسکا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ ایک

مرتبہ ہشام بن عبدالملک اپنی ولی عہدی کے زمانے میں طواف کیلئے آیا۔ شدت ہجوم کی وجہ سے وہ حجر اسود تک نہیں پہنچ سکا اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو استلام کرے (حجر اسود کو چومے) اس درمیان حضرت علی ابن الحسینؑ آ گئے۔ ان کا آنا تھا کہ پورا مجمع کائی کی طرح چھٹ گیا اور انہوں نے با آسانی طواف واستلام کیا۔ وہ جدھر سے گزرتے تھے لوگ احتراماً راستہ چھوڑ دیتے تھے۔ ہشام نے انجان بن کر پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ عداموی کا مشہور ترین شاعر فرزدق نے برجستہ ۱۴۰ شعار کہے اور اسکے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا اور انکا شایان شان تعارف کرایا۔ (تاریخ دعوت وعزایت حصہ اوّل ص ۳۲ مولف علامہ سید ابوالحسن علی ندوی نیز استاد احمد حسین زیات مصری کی کتاب ادب عربی ص ۲۶۳ تاریخ ادب عربی ص ۲۶۱)

حضرت امام محمد باقرؑ

یہ اہلبیت کے پانچویں امام ہیں۔ معروف مصری اسکالر شیخ محمد حضری لکھتے ہیں کہ حضر ابو جعفر محمد بن علی بن حسین جو باقر کے نام سے مشہور ہیں شیعہ امامیہ کے پانچویں امام ہیں۔ علامہ محمد ابن سعد لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور کثیر العلم والحدیث تھے۔ (طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۳۰۲)

مولانا شبلی نعمانی نے لکھا ''امام ابوحنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض

سے ان کی خدمت میں حاضر رہے اور فقہ وحدیث کے متعلق بہت سی نادری باتیں ان سے حاصل کیں۔ شیعہ وسنی دونوں نے مانا کہ امام ابوحنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت محمد (امام باقرؑ) کا فیض تھا"۔ (سیرت نعمان ص ۵۳ مطبوعہ لاہور)

حضرت امام جعفر صادقؑ

عظیم مصری اسکالر محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ اور ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ ان تمام لوگوں کے خلاف ہمیشہ برسر پیکار رہے جنہوں نے اسلام کے خلاف غارت گری کے منصوبے تیار کر رکھے تھے اور مسلمانوں میں الحاد وزندقہ (لادینیت، دہریت) پھیلانے کی سعی تھی۔

(امام جعفر صادق فقہ واجتہاد ص ۱۹۷ مطبوعہ لاہور)

عظیم سنی محقق علامہ شہرستانی لکھتے ہیں کہ علم دین میں امام جعفر صادق مرتبہ عالی پر فائز تھے۔ ادب میں انکا کوئی ہمسر نہ تھا۔ حکمت میں یکتا تھے۔ دنیا سے قطعی بے تعلق تھے۔ زہد اور ورع انکی خصوصیت تھی۔ ایک عرصہ دراز تک مدینہ منورہ میں انہوں نے علمی درسگاہ (یونیورسٹی) کی بنیاد رکھی۔ یہاں طالبان علم کشاں کشاں دور دور سے آتے تھے اور فیض پا کر واپس جاتے تھے۔ آپ سے وابستہ رہ کر پراسرار علوم منکشف کرتے تھے۔ (یہ عالم اسلام کی پہلی یونیورسٹی تھی) انکی مجلس مدینہ میں اہل علم، طالبان حدیث، طلاب فقہ کا مرکز وحید تھی۔ جس شخص

کو بھی ایک مرتبہ انکی خدمت میں حاضر ہونے کی سعادت حاصل ہوئی، وہ انکے علم اور شخصیت کا کلمہ پڑھنے لگا۔ ان کے خلق، حکمت، علم و فضل کی خوشہ چینی پر مجبور ہو گیا۔ (امام جعفر صادق فقہ و اجتہاد ص ۸۱۔۸۵ مطبوعہ لاہور)

امام ابوحنیفہؒ جعفر صدقؑ سے علوم حاصل کئے۔ ابن تیمیہ نے لکھا کہ امام ابوحنیفہ انکے شاگرد کیسے ہو سکتے ہیں۔ جبکہ وہ انکے ہم عصر تھے۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا "یہ ابن تیمہ کی گستاخی اور چشم پوشی ہے۔ امام ابوحنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں انکو حضرت امام صادق سے کیا نسبت؟ حدیث فقہ بلکہ تمام علوم اہلبیت رسولؐ کے گھر سے نکلے و صاحب البیت ادری بما فیھا" گھر والا بہتر جانتا ہے کہ گھر میں کیا کیا ہے۔

(سیرت النعمان ص ۵۳ شائع کردہ اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور)

امامان حقیقت کی مثالیں دوں تو کس سے دوں؟
کہاں سے ڈھونڈ کر لاؤں مثالیں بے مثالوں کی؟

(نواب رام پوری)

امام موسیٰ کاظمؑ

اہلبیت رسولؐ کے ساتویں امام ہیں۔ علامہ ابن حجر مکی صاحب صواعق محرقہ نے لکھا "آپ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم عابد سخی تھے"۔

(صاعق محرقہ ص ۲۰۱)

علامہ ابن طلحہ شافعی نے لکھا "آپ لیل القدر، عظیم الشان جید مجتہد (عالم) تھے اوور اپنی عبادت کی وجہ سے مشہور زمانہ تھے"۔ (مطالب السئول ص ۶۱)

عظیم سنی عالم فضل اللہ بن روز بہان نے لکھا "امام موسیٰ کاظمؑ علائم کرامات اور حسبی نسبی بلندیوں کے عالم ہیں۔ آپ سنت نبویؐ اور طریقہ مصطفویؐ کو زندہ کرنے والے اور دین وملت اسلامیہ کی علامتوں کو واضح کرنے والے ہیں عرب وعجم پر آپ کی محبت فرض کی گئی ہے"۔ (وسیلہ الخادم الی المخدوم مطبوعہ ایران ص ۲۳۰)

ابن ندیم نے اپنی مشہور کتاب الفہرست میں آپ کے چند شاگردوں کے نام اور تصنیفات کو بیان کیا ہے۔ آپ کے صرف ایک شاگرد حسن ابن محبوب نے ۴۲ کتابیں لکھیں جن کے نام ابن ندیم نے لکھے۔

(فہرست ابن ندیم ص ۵۲۲ شائع کردہ ثقافت اسلامیہ لاہور)

حضرت امام علی رضاؑ

مولانا شبلی نے لکھا کہ نہایت بڑے عالم اور اتقائے روزگار (یعنی) وقت کے سب سے بڑے متقی تھے۔ کیونکہ زہد وتقویٰ کے علاوہ فضل وکمال میں

شایان شان تھے۔ اسلئے مامون نے ان کو ولی عہد سلطنت کرنا چاہا۔ چنانچہ تمام اہلیانِ سلطنت واراکین دربار کے سامنے اعلان کیا کہ آج دنیا میں جس قدر آل نبیؐ ہیں، میں انکی لیاقت کا صحیح اندازہ کر چکا ہوں۔ نہ ان میں اور نہ آل نبیؐ میں آج کوئی ایسا شخص موجود ہے جو استحقاق خلافت میں حضرت امام علی رضاؑ کے ساتھ ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ پھر مامون نے تمام حاضرین سے حضرت امام علی رضاؑ کیلئے بیعت لی۔ (المامون ص ۷۷۔۷۸ شائع کردہ مدینہ پبلیشنگ کمپنی کراچی)

حضرت امام محمد تقیؑ

اہلسنت کے عظیم محقق، ابن طلحہ شافعی لکھتے ہیں "آپ اگرچہ باعتبار سن و سال صغیر تھے مگر قدر و منزلت کے اعتبار سے کبیر تھے۔ اپنے والد ماجد کے بعد منصب امامت پر فائز ہوئے"۔ (مطالب السوٴل از ابن طلحہ شافعی)

مامون نے آپؑ سے کئی علمی سوالات کئے۔ آؑ نے برجستہ سب کا جواب دیا تو مامون نے برسر دربار کہا انت ابن الرضا حق "آپؑ واقعی امام رضاؑ کے فرزند ہیں"۔ (صواعق محرقہ ابن حجر مکی ص ۲۰۴)

حضرت امام علی نقیؑ

عظیم سنی عالم لکھتے ہیں "آپؑ کا پورا نام ابوالحسن علی ابن محمدؑ ہے۔ بڑے

زاہد عابد، متقی بزرگ تھے۔ شیعوں کے دسویں امام ہیں''۔

(تاریخ اسلام ندوی جلد۳ ص ۲۳۶ شائع کردہ مکتب رحمانیہ لاہور)

عالم اسلام کی عظیم کتاب مروج الذہب میں لکھا ہے کہ ''خلیفہ متوکل کو اطلاع دی گئی کہ امام علی نقیؑ کے گھر میں شیعان علیؑ چھپے ہوئے ہیں اور اسلحہ جمع کر رکھا ہے۔ اس نے راتوں رات سپاہی گھر میں دوڑا دیئے، انہوں نے گھر کی تلاشی لی اور امام کو گرفتار کر کے لائے۔ امام گھر میں تنہا سنگ ریزوں پر بیٹھے تھے۔ اور صوف کی چادر اوڑھی ہوئی تھی، تلاوت قرآن اور دعاؤں میں مشغول تھے، صرف کچھ علمی کتابیں ہاتھ آئیں۔ سپاہی اسی حالت میں امامؑ کو متوکل کے سامنے لے گئے اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔ متوکل خلیفہ شراب پی رہا تھا، امامؑ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ کھڑے ہو کر احترام کیا اور مدہوشی اور بوکھلاہٹ میں شراب کا جام امامؑ کی طرف بڑھا دیا۔ امامؑ نے فرمایا میرا گوشت اور خون کبھی شراب کی گندگی سے آلودہ نہیں ہوا۔ متوکل نے کہا اگر شراب نہیں پیتے تو کچھ اشعار ہی سنا دیجئے۔ امامؑ نے ایسے اشعار سنائے جس میں موت اور قبر کی سزاؤں کا ذکر تھا۔ شراب کی سخت مذمت تھی۔ متوکل ان اشعار کو سن کر رونے لگا، سارا دربار بھی رونے لگا''۔

(مروج الذہب حصہ چہارم ص ۶۰۲)

حضرت امام حسن عسکریؑ

علامہ ابن ضباغ مالکی لکھتے ہیں ''آپؑ کا اخلاق شیریں، سیرت نیک، عادات وخصائل فاضلانہ تھے''۔(فضول المہمہ ص ۲۶۵)

آپؑ اپنی امامت کے تقریباً چھ سالوں کے دوران مسلسل حکومت کی نگرانی میں رہے۔المعتمد عباسی نے کچھ عرصے جیل میں بھی رکھا۔

امامؑ جیل میں رہتے ہوئے بھوکے لوگوں میں کس قدر مقبول تھے اسکا اندازہ ابن صباغ ملکی کے بیان سے ہوگا۔''جب امامؑ کے انتقال کی خبر مشہور ہوئی تو تمام سامرہ ہل گیا۔ ہر طرف شور وغل برپا ہو گیا۔ بازار سنسان ہو گئے۔ دوکانیں بند ہو گئیں تمام بنو ہاشم اور تمام شعبہ ہائے زندگی کے لوگ اور عوام الناس ان کے جنازے کی طرف دوڑے۔سرمن رائے اس دن قیامت کا نمونہ تھا۔(فضول المہمہ)

حضرت امام مہدیؑ

عظیم سنی عالم شاہ رفیع الدین محدث دہلوی نے لکھا ''حضرت امام مہدیؑ سیّد اولاد فاطمہ زہراؑ سے ہیں۔آپؑ کا چہرہ پیغمبرؐ کے چہرے کے مشابہ ہوگا۔آپ کے اخلاق پیغمبرؐ کے اخلاق سے پوری طرح مشابہت رکھتے ہوں گے۔آپؑ کا علم لدنی (خداداد) ہوگا''۔ (کتاب الامام مہدیؑ ص ۶ شائع کردہ مکتب

سید احمد شہید اردو بازار لاہور)

علامہ ابن خلدون نے لکھا ''آخری زمانے میں خاندان اہلبیتؑ میں سے ایک شخص کا ظہور ہوگا۔ جو دین کو تقویت پہنچائے گا، انصاف کو پھیلائے گا، تمام ممالک پر غالب آئیگا۔ عیسیٰ آسمان سے اتریں گے اور امام مہدیؑ کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ وہ دجال کو قتل کریں گے۔ مسلمانوں کا امام مہدیؑ کے سلسلے میں حدیثوں کا استدلال ہے جو تمام آئمہ اپنی کتابوں میں لکھتے چلے آئے ہیں''۔ اہلسنت کے ہاں 3000 سے زیادہ احادیث موجود ہیں اعتراف میں سیکڑوں آیات موجود ہیں۔

(مقدمہ ابن خلدون حصہ دوئم ص ۱۵۷ شائع کردہ نفیس اکیڈمی کراچی)

۴۔ ان کے مطالبہ کو اہمیت نہ دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ عقل و خرد سے عاری ان افراد نے مطالبہ ہی ایسا کیا تھا۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیتا تو قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا ہو جاتی کیونکہ ان کے مطالبات میں سے ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ ہم آپ پر اس وقت ایمان لائیں گے جب آپ آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرے ہم پر گرائیں گے۔ اب ذرا چشم تصور سے نگاہ کریں اور سوچیں اگر ایسا ہو جاتا تو کیا زمین و آسمان تباہ نہ ہو جاتے۔

بحث امامت

سوال:- آپ کوئی واضح دلیل (دوسرے خلفاء کے ناحق ہونے اور امیر المومنین کے برحق ہونے کی دیں؟

سورۃ برات کے پہنچانے کے متعلق علماء کا اجماع ہے اور اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ابوبکر آنحضرت سے الگ تھے۔ اور اس سے امیر المومنین کی ولایت کے آسمان سے نازل ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

سائل: اس حدیث سے کیا دلیل ملتی ہے؟ حقیقتاً ہمارے اور سینوں کے راویوں نے روایت کی ہے کہ جب سورۃ برات نازل ہوئی پیغمبرؐ نے ابوبکر کو بلایا اور سورہ ان کے سپرد کر دیا کہ یہ سورہ مکہ میں موسم حج میں میری جانب سے تلاوت کر دینا۔ ابھی ابوبکر نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ جبرئیل نازل ہو گئے اور عرض کیا کہ خدائے تعالی آپ کو سلام کہتا ہے اور یہ فرماتا ہے کہ اس سورہ کو یا آپ پہنچائیں یا وہ شخص جو آپ سے ہو، تو پیغمبرؐ نے علیؑ کو بلوایا اور فرمایا کہ تم راستہ میں ہی سورہ ابوبکر سے لے لو اور مکہ پہنچا دو۔ پس امیر المومنین نے فرمودہ رسول ﷺ پر عمل فرمایا اور ابوبکر واپس آ گئے تو اس حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے ابوبکر کی معزولی اور امیر المومنین کی ولایت کا حکم آسمان سے نازل ہوا۔ بعد میں لوگوں نے اس کو اپنا متولی بنالیا جس کو خدا معزول کر چکا تھا اور اسی کو معزول کر دیا جس کو

خدا نے ولی قرار دیا تھا۔ اور مقدم کو موخر اور موخر کو مقدم کر دیا۔ اور خدا کے حکم کی کوئی حقیقت ہی نہ سمجھی۔ تو اس حدیث سے پتہ چلا کہ ابو بکر پیغمبر سے نہیں تھے۔ کیونکہ فرمایا فمن تبعنی (جو میرا اتباع کرے گا وہ مجھ سے ہوگا) اب جب تابع پیغمبر نہیں تھے تو خدا کے دوست بھی نہیں تھے کیونکہ اللہ تعالی فرماتا ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم (سورہ آل عمران آیت ۳۱) (اے رسول کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تمہیں دوست رکھے گا اور بخش دے گا) اب جب خدا کے محبّ اور دوست نہیں ہیں تو پھر پیغمبر ہیں اور پیغمبر کی دوستی ایمان ہوتی ہے اور آپ کی دشمنی کفر ہے۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا کے تو دوست ہوں اور پیغمبر کے دشمن اور اسی حدیث سے ثابت ہو گیا کہ علیؑ پیغمبر سے تھے جیسا کہ مخالفین بھی روایت کرتے ہیں۔

اور اس آیت کی تعمیر مین افمن کان علی بینۃ من ربہ ویتلوہ شاھد منہ (سورۃ ہود۔ آیت ۱۷) اور جو بینہ پرے خدا طرف سے وہ رسول خدا ہیں اور شاھد امیر المومنین ہیں۔ اسی طرح ذکر کیا گیا ہے کہ جنگ احد میں جبرئیل نے علی کو دیکھا کہ پیغمبر کے سامنے جہاد کر رہے ہیں تو جبرئیل نے عرض کی کہ اے محمد یہ مواسات ہے جو یلی کر رہے ہیں تو رسول نے فرمایا: اے جبرئیل علی مجھ سے ہیں اور میں علی سے ہوں۔ جبرئیل نے عرض کی کہ میں آپ دونوں سے ہوں۔ تو جس کو خدائے

تعالیٰ موسم حج میں ایک آیت کی تلاوت کا امین نہ سمجھے تو بھلا کیسے جائز ہوگا کہ وہ تمام دین خدا کو بعد وفات پیغمبر ادا کر سکے۔ جبکہ خدا نے تو سات آسمانوں کے اوپر سے وحی بھیج کر اس کو معزول کیا ہو اور وہ کیوں مظلوم نہ ہو کہ جس کو موخر کر دیا گیا جبکہ اس کی ولایت کا حکم آسمان سے نازل ہوا تھا۔ کسی شخص نے کہا کہ امت گمراہی پر کیسے اکٹھی ہو سکتی ہے جبکہ پیغمبر کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ لا تجتمع امتی علی الضلالۃ (میری امت گمراہی پر اکٹھی نہیں ہو سکتی)۔ فرمایا کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو پھر امت کے معنی سمجھنے چاہئیں امت کا لفظ لغت عرب میں جماعت کے لئے بولا جاتا ہے اور ان کی تعداد کم از کم تین ہوتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایک بھی ہو سکتا ہے۔ اور اللہ ارشاد فرماتا ہے: ان ابرھیم کان امۃ قانتا للہ حنیفا (سورہ نحل آیت ۱۲۰) اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک فرد کے لئے امت کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہم اس حدیث کے صحیح ہونے سے انکار نہیں کرتے کہ اس میں ان لوگوں کے متعلق کہا گیا ہوگا کہ جو حضور کی متابعت کرتے ہیں۔ اور خدا نے تو ایک امت کے لئے کئی امت کا لفظ استعمال کیا اور فرمایا وقطعناھم فی الارض امما (سورہ اعراف آیت ۱۶۸) (ہم نے ان گروہ گروہ کر کے تقسیم کر دیا) اور یہ بھی فرمایا قطعناھم اثنتی عشرہ اسباطا امما (سورہ اعراف آیت ۱۶۸) (اور ہم نے ان کے گروہ کے گروہ زمین میں متفرق کر دئے) اور فرمایا وممن خلقنا امۃ

یھدون بالحق وبہ یعدلون (سورۃ اعراف آیت ۱۸۱) (ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے پیدا کیا ہے لا تجتمع امتی علی الضلالۃ۔ کسی نے کہا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ وفات پیغمبر کے فوراً بعد اتنی کثیر تعداد مرتد ہوگئی۔ فرمایا کیونکہ ممکن نہیں ہوسکتا جبکہ خدائے تعالیٰ فرمارہا ہے قبلہ الرسل فان مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم (سورہ آل عمران آیت ۱۴۴) (محمد سوائے رسول کے کچھ نہیں ہیں ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزرے ہیں۔ اگر وہ انتقال کر جائے یا قتل ہو جائے تو کیا تم پچھلے پاؤں پلٹ جاؤ گے) اور کیا امت پیغمبر کا ارتداد قوم موسیٰ کے ارتداد سے قریب تر نہیں ہے جبکہ وہ طور پر گئے اور کہا کہ اے ہارون تم میرے جانشین بنالخ اور قوم سے وعدہ کیا کہ تیس ۳۰ راتوں کے بعد وہ واپس آجائیں گے پھر اللہ تعالیٰ نے دس راتوں کا اضافہ کر دیا تو بنی اسرائیل نے ہارون کو کمزور سمجھا اور گؤ سالہ پرستی شروع کر دی۔ موسیٰ واپس آئے تو ہارون پر ناراض ہوئے۔ غرض تمام واقعات رونما ہوئے تو جیسے قوم موسیٰ مرتد ہوئی اسی طرح ممکن ہے کہ قوم پیغمبر بھی مرتد ہوگئی۔ جبکہ یہاحتمال تھا کہ موسیٰ واپس آسکتے ہیں کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ مرے نہ ہوں۔ جبکہ ہمارے پیغمبر کے ساتھ اتنا احتمال بھی نہ تھا۔ اور علی ان مرتدین سے جنگ کرنے سے ایسے ہی معذور تھے جیسے ہارون معذور تھے۔ فرمایا ابوبکر کی امامت کے قائل یہگمان کرتے ہیں کہ پیغمبر نے خلیفہ مقرر نہیں تھا اور امت نے

ابو بکر کو خلیفہ بنایا تو اگر خلیفہ قرار نہ دینا صحیح ہے تو امت نے غلط کیا اور اگر خلیفہ قرار دینا صحیح ہے تو پیغمبر نے غلطی کی۔ اب آپ بتایئے کہ خطا کی نسبت امت سے دینا سزاوار ہے یا نہیں؟ امت اس بات کی زیادہ سزوار ہے کہ اس سے خطا کی نسبت دی جائے۔ پھر پیغمبر کے لئے یہ کیسے روا ہے کہ دنیا سے جائے اور خلیفہ کا تعین نہ کرے حالانکہ اگر ایک کاریگر و یہات میں بھی مرے اور اس کا پھاوڑا یا تیشہ ہو تو استک کے لئے کسی نہ کسی کو وصی مقرر کرتا ہے۔

لوگوں کا گمان ہے کہ پیغمبر نے خلیفہ کا تعین نہیں کا کیا اور انہوں نے آپ کی مخالفت کر کے خلیفہ معین کر لیا اور ابو بکر نے بھی مخالفت کی اور عمر کو خلیفہ قرار دید یا اور عمر نے خلیفہ نہ بنا کر نہ تو پیغمبر کا اتباع کیا اور نہ خلیفہ بن کر ابو بکر کی متابعت کی بلکہ مجلس شوریٰ قرار دیدی۔

یہ بات تو خوب آشکار اور واضح ہوگئی اب اس بات کو واضح کریں کہ پیغمبر کے مرض موت کے وقت سنی کہتے ہیں کہ ابو بکر نے پیش نمازی کی تھی۔ سنیوں کا یہ گمان ہے کہ پیغمبر نے ابو بکر کو مقدم کیا تھا لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے وہ خود اس میں اختلاف رکھتے ہیں بعضکہتے ہیں کہ پیغمبر نے عائشہ سے کہا کہ اپنے باپ سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں اور جب ابو بکر نماز پڑھانے گئے تو پیغمبر ایک ہاتھ علی پر اور دوسرا ہاتھ عباس پر سہارے کے لئے رکھے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے اور

ابوبکر کو ان کی جگہ سے ہٹا کر لوگوں کو بیٹھ کر نماز پڑھائی اور ابوبکر ان کے پیچھے اور لوگ ابوبکر کے پیچھے تھے اور بعض یہ روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر نے حفصہ سے کہا کہ اپنے باپ سے کہو کر وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں اور یہ حدیث صحیح نہیں ہے کیونکہ سقیفہ میں مہاجرین اور انصار نے اس حدیث کو حجت نہیں بنایا اور اگر اس حدیث کو صحیح بھی مان لیا جائے تو بھی اس سے ابوبکر کی امامت لازم نہیں ہو جاتی کیونکہ اگر نماز میں پیش نمازی سے ہی امامت ثابت ہوتی ہے تو پھر امامت کا زیادہ حقدار عبدالرحمٰن بن عوف ہو جائے گا کیونکہ سنیوں ہی کی روایت ہے کہ پیغمبر نے اس کی اقتداء کی تھی۔ اور سنیوں کو اس حدیث میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے جس طرح سے کہ انہوں نے امامت ابوبکر میں اختلاف کیا ہے۔ نیز ہمارے اوپر یہ کیسے ضروری ہو گیا کہ ہم عائشہ اور حفصہ کی حدیث کو تو قبول کریں جبکہ اس روایت میں وہ اپنی ذات اور اپنے اپنے باپ کے لئے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں اور یہ لوگ فدک کے معاملہ میں قول فاطمہ کو کیوں نہ قبول کریں جبکہ پیغمبر نے فدک ان کو بخش دیا تھا اور چند سال تک جناب طاطمہ کے ہاتھ میں رہا بھی تھا جب تک ان کے والد بزرگوار زندہ تھے۔ اور فاطمہ تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہیں اور اس معاملہ میں علی حسنین اور ام ایمن نے گواہی بھی دی اور وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ علی کی شہادت قابل قبول نہیں ہے کیونکہ وہ اپنا فائدہ چاہتے ہیں تو پھر عائشہ اور حفصہ

کی حدیث کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ ان کی بات کو تو دس درہم بلکہ اس سے کم کے لئے بھی نہیں مانتے (یہاں تک کہ لوگ اس پر جمع نہ جائیں) کسنی کہا کے لیکن تم بارہ اماموں کے کیسے قائل ہو جبکہ خدا نے تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء بھیجے اور تم کہتے ہو کہ امام بارہ سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتے۔ جواب: امامت اللہ تعالیٰ کی جانب سے فریضہ اور خدا نے کوئی فریضہ عدد کے بغیر مقرر نہیں کیا۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ سب و روز میں صرف سترہ رکعت نماز فرض کی ہے اور زکوۃ کی مقدار مالی اضاف پر جو طے شدہ ہیں اور وہ ہم شیعوں میں نہیں ہوتی اور غیر شیعوں میں بہت ہوتی ہے۔ اسی طرح روزے، حج کے ایام معین ہیں۔ اسی طرح امام کی تعداد بھی معین ہونی چاہئے جس طرح ہم نہیں کہہ سکتے کہ نماز سترہ رکعت کیوں ہے۔

سوال: کیا اللہ تعالیٰ نے فرائض اور ان کی تعداد کو قرآن میں بیان فرمایا ہے۔

جواب: لیکن پیغمبر نے اپنی سنت میں تو ان کے اعداد بیان کئے ہیں اور یہ تعین پیغمبر امر خدا سے کرتے ہیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے وانزلنا الیک الزکر لتبین للناس مانزل الیھم (سورۃ نحل آیت ۴۴) (ہم نے تمہاری طرف قرآن نازل کیا ہے اسے تم لوگوں کے لئے کھول کر بیان کرو) اللہ تعالیٰ نے اقم الصلوۃ فرمایا پیغمبر نے تفصیل بیان کی۔ اور اس نے خذ من اموالھم صدقۃ فرمایا پیغمبر نے

اس کا تعین کر دیا اور اس نے وللہ علی الناس حج البیت فرمایا پیغمبر نے مناسک بیان فرمائے۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ نے کہا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الا مرمنکم فرمایا پیغمبر نے ان کی تعداد مقرر فرمادی کہ بارہ ہوں گے سائل کہا کہ اس تعداد میں تو سنی بھی آپ کی موقفقت نہیں کرتے ہیں۔ جواب: مخالفین کی مخالفت سے کوئی نقصان نہیں ہوتا ورنہ ہمارے پیغمبر کی بنوت بھی باطل ہو جائے گی کیونکہ یہود و نصاریٰ ان کی بنوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ دنیا کا کوئی ایس امسئلہ نہیں جس میں مخالفت نہیں ہو۔ سائل نے کہا: یہ تو ٹھیک ہے لیکن اب آپ مجھے اپنے امام صاحب الزمان کے متعلق بتائیں کہ وہ کب تشریف لائیں گے؟ فرمایا کہ خدا نے صاحب الزمان کو کسی خاص مصلحت سے غائب کر دیا ہے لہذا آپ کے ظہور کا وقت بھی خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا اور پیغمبر نے فرمایا کہ میرے فرزندوں میں قائم کی مثال قیامت کی سی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قامت کے بارے میں فرمایا قل علمھا عندربی (اے رسول کہہ دیجئے کہ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے) سائل نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اتنی طویل عمر پائیں۔ کہا: اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ کیا بہت زیادہ عمر رسیدہ لوگوں کی عمر کے متعلق آپ نے نہیں سنا؟ سائل نے کہا: سنا ہے لیکن وہ باتیں صحیح نہیں ہیں۔ فرمایا: خدا نے جو فرمایا وہ تو صحیح ہے کہ وہ کہتا ہے کہ نوح ۵۰ سال کم ۱۰۰۰ سال کے لئے مبعوث ہوئے۔ سائل نے کہا: یہ

درست ہے لیکن زمانہ کسی کے لئے اتنی طویل عمر میری امت میں بھی وہی ہوگا اور چونکہ زمانہ اس قدر طویل عمر کا متحمل نہیں ہوتا لہذا اتنی عمر انسانوں میں سے بہترین قسم کے لئے ہونی چاہئے اور وہی ہستی صاحب الزمان کی ہے۔اور یہ سنت ان میں باقی ہے سائل نہ کہا غیبت کے باوجود آپ کے وجود میں مصلحت کیا ہے۔فرمایا: کہ آپ کا وجود بقائے زمین وآسمان کے لئے ضروری ہے ورنہ آسمان سے ایک قطرہ پانی نازل نہیں ہوگا۔اورزمین سے برکتیں ظاہر نہ ہونگی۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وماکان اللہ لیعذبھم وانت فیھم (سورہ انفال آیت ۳۳) (جب تک آپ ان کے درمیان موجود ہیں خدا ان پر عذاب نہیں کرے گا) تو جب اس نے وجود پیغمبر کی وجہ سے لوگوں پر عذاب نہیں کیا تو اسی طرح امام کے وجود کی وجہ سے عذاب نہیں کرتا کیونکہ امام پیغمبر کے جانشین ہیں ماسوا اس کے کہ ان پر وحی نہیں ہوتی۔اور ہمارے اور سنیوں کے راویوں نے روایت کی ہے کہ ستارے اہل آسمان کے لئے باعث امان ہیں اگر ستارے نہ ہوں تو اہل آسمان پر وہ آفتیں آتیں کہ جن کو وہ ناپسند کرتے ہوں۔اسی طرح میرے اہلبیت امان ہیں اہل زمین کے لئے اگر وہ نہ ہون تو زمین پر ایسی بلائیں نازل ہوں کہ جو لوگوں کے لئے انتہائی ناپسندیدہ ہوں نیز ارشاد پیغمبر ہے کہ اگر زمین پر حجت کا وجود نہ ہو تو زمین تمام مخلوقات کو نگل لے گی یا اس کو ایسے زلزلہ

آئے گا جیسے دریا موجیں مارتا ہے۔ بعض روایات میں لساحت الارض باھلھا اور بعض میں لماجت باھلھا کمایموج البصر باھلہ ہے سائل نے کہا: کیسی پیاری بات ہے۔ اور حاضرین دربارے سے کہا: یہی بات حق ہے اور اس کے علاوہ جو فرقہ ہے وہ باطل پر ہے۔ بعض نے کہا کہ جب سر امام حسین کو نیزہ پر چڑھایا گیا تو وہ سر سورۃ کہف کی تلاوت کر رہا تھا۔ سائل نے کہا: میں نے ایسی کوئی بات نہیں سنی لیکن اب میں ان سے اس کے متعلق پوچھتا ہوں۔ چنانچہ اس نے خط لکھا تو جواب آیا کہ یہ خبر اس سے روایت کی گئی ہے جس نے سر مطہر امام سے سورہ کہف کی تلاوت کو سنا تھا۔ یہ کسی امام کی روایت نہیں ہے اور میں اس کا انکار نہیں کرتا بلکہ میں کہتا ہوں کہ یہ بات ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ہمیں یہ اطلاع دی ہے کہ قیامت کے دن ہمارے ہاتھ پاؤں ہمارے بارے میں گفتگو کریں گے اور اپنے کاموں کی گواہی دیں گے جو انہوں نے انجام دیئے تھے تو جب خدا ایک گناہگار کے ہاتھ پاؤں میں قدرت تکلم پیدا کر سکتا ہے تو اس کو یہ بھی قدرت حاصل ہے کہ سر امام حسین کو دنیا میں ہی گویا کر دے کیونکہ آپ جانشین پیغمبر بھی ہیں اور جنت کے دو سرداروں میں سے ایک ہیں اور دنیا کی عورتوں کی سردار کے فرزند ہیں۔ اور ان کے والد گرامی سید وصیین وامیر المومنین ہیں۔ چنانچہ حسین کے بارے میں اس چیز کا انکار نہیں کرنا چاہئے اور یہ خدا کی

قدرت سے دور بات نہیں ہے بلکہ حیرت انگیز مرحلہ تو وہ ہے کہ آپ پر ملائکہ روئے ،آسمان نے آپ کی شہادت پر خون برسایا اور جنوں نے آپ پر نوحہ کیا۔ جو ان کا منکر ہوگا وہ شریعت و معجزات پیغمبر کا منکر ہے کیونکہ سب ہی نے ان کی روایت کی ہے۔ یہ اس خط کا خلاصہ تھا۔

سوال: حضرت علی علیہ السلام کے متعلق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی متواتر حدیث ہے۔ من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ۔ ''جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔''

آپ سے التماس ہے کہ لغت عرب میں لفظ مولا کے کیا معانی ہیں اور حدیث مذکور میں لفظ مولا کس معنی میں استعمال ہوا ہے، اس کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: لغت میں لفظ مولا کے سولہ معانی ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

(۱) مالک۔(۲) رب۔(۳) آزاد کرنے والا (آقا)۔(۴) آزادی حاصل کرنے والا (غلام)۔(۵) ہمسایہ۔(۶) پشت سر اور پیش رو۔(۷) تابع (۸) ضامن جریرہ یعنی جس سے عہد و پیمان وابستہ ہو۔(۹) داماد۔(۱۰) چچازاد۔(۱۱) انعام کرنے والا۔(۱۲) جس پر انعام کیا گیا ہو۔(۱۳) محب اور دوست۔(۱۴) مددگار۔(۱۵) جس کی اطاعت کی جائے

(سردار)۔(جو امور میں حق تصرف رکھتا ہو۔

لفظ مولا کے درج بالا سولہ معانی ہیں اور جب بھی کلام عرب میں اس لفظ کا اطلاق ہوگا تو معانی کے تعین کیلئے کلام کے سیاق وسباق اور موقع محل کو دیکھا جائیگا۔

پیغمبر اکرم نے غدیر خم کے مجمع عام میں اپنے بھائی حضرت علی علیہ السلام کا بازو پکڑ کر تمام حاضرین کو دکھا کر فرمایا تھا: من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ. جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔''

اب آیئے دیکھیں کلام کے سیاق وسباق اور موقع ومحل کی مطابقت سے لفظ مولا کا یہاں کونسا معنی مراد لیا جاسکتا ہے۔

پہلے بارہ معانی تو مذکورہ صورت مین کسی قیمت پر درست نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے اکثر معانی غیر صحیح اور کچھ مضحکہ خیز ہیں۔البتہ تیرہواں یعنی محبّ اور دوست کا معنی کچھ نہ کچھ درست دکھائی دیتا ہے۔مگر اس معنی کے لئے بھی لفظی قرینہ موجود نہیں ہے اور اسے ظاہر کرنے میں کوئی حکمت بھی نہیں ہے کیونکہ سخت گرمی میں ہزاروں افراد کو بٹھا کر، پالانوں کا منبر بنا کر اگر رسول خدا نے یہ اعلان کیا ہو کہ ''جس کا میں دوست ہوں اس کا علی دوست ہے۔'' یقیناً یہ اتنے بڑے اہتمام کے منافی ہے کیونکہ اس بات کو تمام مسلمان پہلے سے ہی جانتے تھے کہ

محمد ﷺ مصطفیٰ اور علی مرتضیٰ ہمارے دوست ہیں اور پھر یہ دوستی صرف رسول خدا ﷺ اور علی مرتضیٰ تک محدود بھی نہیں تھی بلکہ تمام اہل ایمان پہلے سے ہی ایک دوسرے کے خیر خواہ اور دوست تھے کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان موجود ہے: والمؤمنون والمؤمنات بعضھم اولیآء بعض. (توجہ ۷۱) ''مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے خیر خواہ ہیں اور ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

اور پھر یہ خیر خواہی اور دوستی صرف بنی آدم تک کے اہل ایمان تک محدود نہیں تھی بلکہ فرشتے بھی اہل ایمان کے خیر خواہ اور دوست جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ملائکہ کے قول کو نقل کرتے ہوئے فرمایا: نحن اولیآء کم فی الحیاۃ الدنیا وفی الاخرۃ.... (فصلت ۳۱) ''ہم دنیاوی زندگی اور آخرت میں تمہارے خیر خواہ اور دوست ہیں۔''

اسی لئے اگر رسول خدا نے دوستی کو ظاہر کرنا ہوتا تو پھر آپ کو اتنے بڑے اہتمام کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے بڑی اہتمام سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اکرم نے یہ معنی مراد نہیں لیا تھا البتہ چار و نا چار پندرہواں سولہواں معنی ہی درست تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ قرائن عقلیہ اور کلام کے سیاق وسباق کے پیش نظر یہی دو معانی درست معلوم ہوتے ہیں اور ویسے بھی پندرہویں اور سولہویں معنی

میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔

لفظ مولا کے معنی متعین کرنے کے لئے آنحضرت کا مکمل فرمان دیکھنا چاہئے۔ آنحضرت نے علی کے مولا ہونے کا اعلان بعد میں کیا۔ اس سے پہلے آپ نے یہ الفاظ فرمائے: الست اولی بکم من انفسکم۔ ''کیا میں تمہاری جانوں پر تم سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟ اس کے جواب میں تمام حاضرین نے بیک زبان ہو کر کہا: بلی یارسول اللہ'' کیوں نہیں! آپ ہم پر ہم سے بھی زیادہ حق تصرف رکھتے ہیں۔''

جب آنحضرت تمام حاضرین سے اپنے متصرف ہونے کا اقرار کرا چکے تو پھر آپ نے حضرت علی کے بازو کو پکڑ کر بلند کیا اور فرمایا: من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ ''جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ علی مولا ہے۔'' کلام کا سیاق وسباق مدنظر رکھ کر مذکورہ جملہ کا صرف مفہوم ہوسکتا ہے کہ جس کا میں اولیٰ بالتصرف ہوں، اس کا یہ علی اولیٰ بالتصرف ہے۔

کلام کے سیاق وسباق کو مدنظر رکھا جائے تو لفظ مولا کا آخری معنی ہی صحیح اور حتمی قرار پاتا ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا معنی صحیح نہیں ہوسکتا۔

علاوہ ازیں حضرت عمر نے جن الفاظ سے حضرت علی کو مبارکباد دی تھی اس سے بھی حضرت علی کا اولیٰ بالتصرف ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

روایات میں وارد ہے کہ حضرت عمر نے حضرت علی کو مبارک دیتے ہوئے کہا تھا: بخ بخ لک یا علی! اصبحت مولای ومولا کل مؤمن ومؤمنۃ ''علی! مبارک ہو تم میرے اور ہر مومن مرد اور عورت کے مولا بن گئے۔''

اگر مولا کے معنی دوست کے ہوتے تو کیا حضرت عمرؓ حضرت علی کو پہلے اپنا اور مومنوں کا دوست نہیں سمجھے تھے؟ اور اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ مولا کے معنی دوست کے ہیں تو مومن مردوں سے تو علی کی دوستی ہو سکتی ہے مومن عورتوں سے دوستی کے کیا معنی ہوں گے؟

ابن اثیر جزری نے کتاب نہایہ میں تسلیم کیا ہے کہ حضرت عمر کی مبارکبادی میں لفظ مولا اولیٰ بالتصرف کے معانی میں ہے۔

حضرت حسانؓ بن ثابت دربار نبوی کے شاعر تھے انہوں نے آنحضرت سے اجازت پانے کے بعد واقعہ غدیر پر اپنا مشہور قصیدہ کہا تھا جس میں انہوں نے یہ شعر کہا: فقال لہ قم یا علی فانی رضیتک من بعدی اماما وھادیا

''رسول نے کہا: علی! کھڑے ہو جاؤ، میں نے تمہیں اپنے بعد امام اور ہادی مقرر کیا ہے۔''

حسان عرب تھے اور عربی زبان کی باریکیوں اور مطالب کو خوب سمجھتے تھے۔ اگر حضور اکرم نے لفظ مولا کو دوست کے معنی میں کہا ہوتا تو وہ کبھی لفظ مولا کا

ترجمہ امام اور ہادی نہ کرتے۔

اخطب کوارزمی نے حدیث غدیر کے ضمن میں زید بن ارقم اور عبدالرحمٰن ابن ابی لیلیٰ اور ابن عباس سے یہ الفاظ روایت کئے کہ آنحضرت نے فرمایا: انت امامکل مؤمن ومؤمنۃ بعدی وولی کل مؤمن ومؤمنۃ ''تو میرے بعد ہر مومن مرد وعورت کا امام ہے اور ہر مومن مرد وعورت کا سرپرست ہے۔''

مقام غدیر کے علاوہ بھی رسول اکرم نے اپنے صحابہ سے اپنے اور علی کے اولی ومولیٰ ہونے کا اقرار کرایا تھا جیسا کہ احمد بن حنبل، ابن نغاذلی اور شافعی وابن مردویہ نے بریدہ سے روایت کی کہ میں سفر یمن سے واپس آیا اور میں نے رسول خدا کی خدمت میں حضرت علی کی شکایت کی تو آنحضرت نے فرمایا: یا برید! الست اولی بالمؤمنین من انفسھم ''بریدہ! کیا میں مومنین جانوں پر ان سے زیادہ حق تصرف نہیں رکھتا؟

میں نے کہا: کیوں نہیں! آپ ہمارے اولیٰ بالتصرف ہیں۔

پھر آنحضرت نے فرمایا: من کنت مولافعلی مولاہ وان علیا اولی الناس بکم بعدی ''جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے اور میرے بعد علی ہی تم سب کا حاکم ہے۔''

اور واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی: یا ایھا الرسول بلغ

ماانزل الیک من ربک وانلم تفعل فما بلغت رسالتہ .....(المائدہ ٦٧)''اے رسول! آپ اس امر کی تبلیغ کریں جو آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ کے پیغام کو پہنچایا ہی نہیں۔''

اس سخت تاکیدی حکم کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت نے غدیر خم کے مقام پر پڑاو ڈالا اور چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ہزاروں افراد کو بٹھا کر خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ نے ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' کا اعلان فرمایا۔

اگر بالفرض پیغام کی نوعیت بس اتنی سی تھی کہ جس کا میں دوست ہوں اس کا علی دوست ہے تو اتنے عام سے پیغام کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کو اتنا تحدیدی حکم جاری کیوں فرمایا؟

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ جب پیغمبر اسلام مقام غدیر خم پر حضرت علی کا بازو پکڑ کر ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' کا اعلان کیا تو اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو کامل کرنے کا اعلان کیا اور فرمایا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ ٣)''آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کیا اور تم پر اپنی نعمت کو تمام کیا اور تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔''

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضور اکرم نے تو صرف یہی فرمایا تھا کہ

''جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے'' اور اگر مولا سے دوست مراد ہے تو گویا آنحضرت نے تو صرف یہی اعلان کیا تھا کہ ''جس کا میں دوست ہوں اس کا علی بھی دوست ہے'' تو یہ بات اتنی اہمیت کی حامل ہرگز نہیں تھی کہ اللہ اس کی وجہ سے اپنے دین کو کامل کرتا اور نعمتوں کو تمام کرتا اور دین اسلام پر اپنی رضا کی مہر ثبت فرماتا۔

اور اس ''مولا'' کے معنی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ سورۃ معارج کی ابتدائی آیات کی شان نزول پر بھی توجہ کی جائے۔

علمائے مفسرین نے لکھا ہے کہ واقعہ غدیر کے بعد حارث بن نعمان فہری آنحضرت کی خدمت میں آیا اور آ کر کہا: محمد! آپ یہ بتائیں کہ آپ نے ہمیں بت چھوڑنے اور اسلام قبول کرنے کی جو دعوت دی اور ہمیں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے اور حج کرنے کے جو احکام دیئے ہیں یہ اپنی طرف سے کہا یا اللہ کی طرف سے کہا؟

آنحضرت فرمایا: حکم خدا کا تھا اور پیغام لانے والا جبرئیل تھا اور حکم میں نے سنایا تھا۔

پھر حارث بن نعمان نے کہا: محمد! تو اتنی باتوں پر بھی راضی نہیں ہوا یہاں تک کہ تو نے اپنے ابن عم علی کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا اور اعلان کیا ''جس کا

میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے" تو کیا یہ حکم اللہ کی طرف سے تھا یا تمہاری اپنی طرف سے تھا؟

آنحضرت نے فرمایا: حکم خدا کا تھا اور پیغام لانے والا جبرئیل تھا اور حکم میں نے سنایا تھا۔

یہ سن کر اس نے کہا: پروردگار! اگر محمد اس بات میں سچا ہے تو ہم پر پتھروں کی بارش فرما اور ہم پر دردناک عذاب نازل فرما۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی اونٹنی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ آسمان سے ایک پتھر آ کر اس کے سر پر گرا اور وہ ہلاک ہو گیا۔

اب سوال یہ اگر "مولا" کے معنی دوست کے ہی تھے تو حارث نعمان بھی عرب تھا اور وہ عربی زبان کو بخوبی جانتا تھا، اس نے اس پر اعتراض ہی کیوں کیا اور اسے عذاب مانگنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر یہ کہ رسول خدا بھی تو اسے سمجھا سکتے تھے کہ بندہ خدا تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہا ہے میں نے کونسا علی کی امامت وحکومت کا اعلان کیا ہے میں نے تو بس یہی کہا ہے کہ "جس کا میں دوست ہوں اس کا علی دوست ہے۔" اس پر یقیناً اس کا غصہ جھاگ کی طرح سے بیٹھ جاتا اور اسے عذاب طلب کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ نہ تو رسول خدا نے اسے تسلی دی اور نہ ہی اسے

سمجھانے بجھانے کی کوشش کی اور نہ اللہ نے عذاب بھیجنے میں کوئی تاخیر کی۔

ان تمام قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مولا کے معنی دوست و مددگار کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی حاکم اور متصرف امور کے ہیں۔

حضرت علی بھی حدیث غدیر کو اپنی امامت وخلافت کے لئے نص قطعی قرار دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ احمد بن حنبل اور دیگر محدثین نے روایت کی ہے کہ حضرت علی نے مسجد کوفہ میں مسلمانوں کو قسم دے کر کہا: لوگو! میں تمہیں خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ جس نے مقام غدیر خم پر آنحضرت سے "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" کا اعلان سنا ہو تو وہ اٹھ کر اس کی گواہی دے۔ اس پر تیس افراد نے اٹھ کر گواہی دی کہ ہم مقام غدیر پر موجود تھے اور رسول خدا نے فرمایا تھا: الستم تعلمون انی اولی بالمؤمنین من انفسھم قالوا بلی یا رسول اللہ "کیا تم نہیں جانتے کہ میں مومنین کی جانوں سے زیادہ ان پر تصرف کا زیادہ حق رکھتا ہوں؟"

سب نے کہا: کیوں نہیں یا رسول اللہ۔

پھر آنحضرت نے آپ کا بازو پکڑ کر بلند کیا تھا اور فرمایا تھا: من کنت مولاہ فعلی مولاہ "جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔"

اگر مولا بمعنی دوست ہوتا تو حضرت علی کو گواہی طلب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اور دوست ہونا کوئی اتنی بڑی بات بھی تو نہیں تھی جس پر علی فخر

کرتے کیونکہ تمام مومنین پہلے سے ہی ایک دوسرے کے دوست تھے۔اعلان غدیر کی معنویت کے لئے یہ دیکھنا بھی بڑا ضروری ہے کہ مقام غدیر ایسا مقام ہے جہاں سے ہر طرف کو راستے نکلتے تھے اور ستر ہزار یا اس سے کم وبیش حجاج کرام کا قافلہ جو کہ دس بارہ میلوں میں پھیلا ہوا تھا سے آنحضرت کے حکم کے تحت جمع کیا گیا اور سخت دھوپ میں پالانوں کا منبر نصب کیا گیا اور ''الست اولی بکم من انفسکم'' کے الفاظ سے اپنا اولیٰ اور متصرف ہونے کا اقرار کرانے کے بعد ''من کنت مولاہ فعلی مولاہ'' کا اعلان کیا گیا۔اس پس منظر کے بعد بھی اگر یہ کہا جائے کہ اس کا معنی ومفہوم صرف یہی تھا کہ علی بھی تمہارا دوست ہے تو یقیناً یہ عقل وخرد کی نفی ہے اور ایسے افراد سے یہ پوچھنا چاہئے کہ اتنے غیر اہم اعلان کے لئے ہزاروں افراد کو چلچلاتی دھوپ میں بٹھانے کی کیا تک تھی جبکہ اس بات کو تو تمام لوگ پہلے سے ہی جانتے تھے؟

اگر امت اسلامیہ کے افراد ضد چھوڑ دیں اور اپنے ضمیر و وجدان کی عدالت میں اس مسئلہ کو پیش کریں تو ہمیں یقین ہے کہ ان کا ضمیر اور ان کا قلب سلیم اس بات کی گواہی دے گا کہ حدیث کا اول وآخر مفہوم یہی ہے کہ ''جس کا میں حاکم اور متصرف ہوں اسکا علی حاکم اور متصرف ہے۔''

اس حدیث کی مزید وضاحت اور مخالفین کے اعتراضات کے جواب

کے لئے کتاب ''کفایۃ الموحدین'' کی طرف رجوع فرمائیں۔

ایک ہی وقت میں متعدد مقامات پر موجود ہونا

سوال: حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے جنگ نہروان کے موقع پر اپنے لشکر کو ایک کنوئیں سے پانی پلایا تھا۔ کنوئیں پر پانی پلانے والے بھی علی تھے اور کنوئیں سے کچھ فاصلے پر اپنے لشکر کے دوسرے حصے کو پانی پلانے والے بھی علی تھے اور غالی افراد اس قسم کی روایات کے پیش نظر غلو کرنے لگ جاتے تھے تو کیا یہ اور اس طرح کے دیگر واقعات صحیح ہیں، اگر صحیح ہیں تو کیسے؟

جواب: حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر موجود ہونا ہمارے مسلمات میں سے ہے اور اس کے علیحدہ علیحدہ موقع ہیں اور جنگ خیبر کے متعلق روایت کہ یہودی لشکر کے سترہ حصے بن گئے اور ہر حصے کے پیچھے حضرت علی تلوار چلا رہے تھے۔

اسی طرح جنگ صفین میں لشکر کتیبہ کی تعداد پچیس ہزار افراد پر مشتمل تھی اور ان کے مقابلے میں تنہا حضرت علی گئے۔ آپ نے ان سے جنگ کی اور آخر کار پچیس ہزار کا لشکر آپ کے حملوں کی تاب نہ لاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا اور جب یہ لشکر معاویہ کے پاس پہنچا تو ان میں سے ہر ایک فوجی نے یہ کہا کہ ''ہم نے جدھر بھی نگاہ کی علی ہمیں شمشیر و سناں لے کر جنگ کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

بہت سی روایات میں وارد ہے کہ مرنے والا ہر شخص حالت احتضار میں آپ کا مشاہدہ کرتا ہے کہ ہر منٹ میں دنیا میں ہزاروں شخص مرتے ہیں اور مرنے والے افراد کسی ایک علاقے سے بھی مربوط نہیں ہوتے کوئی مشرق میں مر رہا ہے کوئی مغرب میں مر رہا ہے اور کوئی ایک براعظم میں اور کوئی دوسرے براعظم میں مر رہا ہے مگر اس کے باوجود تمام مرنے والے حضرت علی کو دیکھ کر ہی مرتے ہیں۔ حضرت کے بیک وقت متعدد مقامات پر حاضر ہونے کی وجوہات کے متعلق علماء نے بحثیں کی ہیں۔ علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں اسکی وجہ پر بحث کی جسکا خلاصہ یہ ہے:

''حضرت امیر المومنین'' متفرق مقامات پر اپنے جسم اصلی و مادی سے نہیں گئے بلکہ آپ اپنے جسم مثالی سے تمام مقامات پر حاضر ہوئے۔ جسم مثالی انتہائی لطیف ہوتا ہے اور شکل وصورت میں جسم مادی کی مکمل شبیہ ہوتا ہے۔ عالم برزخ میں ارواح کا تعلق بھی اسی جسم مثالی سے ہوتا ہے اور ولایت کلیہ کے حامل حضرات کو اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت عطا کی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں بدن مثالی کے ساتھ مختلف مقامات پر حاضر ہو سکتے ہیں اور جس عمل کا ارادہ کریں اور جہاں ارادہ کریں اسے سرانجام دے سکتے ہیں۔''

حاجی نوری مرحوم نے کتاب دارالسلام کے آخر میں اور وجوہات کا بھی

تذکرہ کیا ہے۔مزید تحقیق کے لئے کتاب مذکور کی طرف رجوع فرمائیں۔

کیا امام پر غشی اور بیہوشی طاری ہوسکتی ہے؟

سوال: غشی بے ہوشی ہوتی ہے اور امام کے لئے جائز نہیں ہے۔مگر دوسری طرف یہ بھی مشہور ہے کہ امیر المومنین رات کے وقت خوف کدا اور عظمت خدا کی وجہ سے غش کر جاتے تھے اور ان کا وجود خشک لکڑی کی مانند ہو جاتا تھا۔

ایک روایت مین یہ الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں: امام حسن مجتبی نے اپنی حالت احتضار میں امام حسین سے کہا تھا کہ ہم ایسا خاندان ہیں کہ ہم پر بے ہوشی طاری نہیں ہوتی اور امام حسین سے کہا تھا کہ ہم ایسا خاندان ہیں کہ ہم پر بے ہوشی طاری نہیں ہوتی اور امام حسن حضرت عزرائیل کے آنے تک امام حسین کے ہاتھ کو ہاتھ میں لئے رہے۔

غشی میں عقل زائل ہو جاتی ہے جبکہ امام حجت خدا ہوتا ہے اور حجت خدا کے لئے عقل کے زائل ہونے کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے اور پھر روایات میں بھی تعارض پایا جاتا ہے۔

درخواست ہے کہ اس مسئلہ کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: امام کی عقل وادراک جنون ودیوانگی کی وجہ سے زائل نہیں ہوسکتی لیکن مناجات کی شدت توجہ اور کمال استغراق کی وجہ سے ان پر غشی طاری

ہونے میں کوئی قباحت نہیں ہے اور ان پر ایسی حالت طاری ہو جاتی ہے جب انہیں اپنے اردگرد اور پس وپیش کا کوئی خیال تک نہیں رہتا۔

امام محمد باقر کے متعلق منقول ہے کہ آپ نماز پڑھ رہے تھے اور آپ کا ایک بچہ گھر کے کنوئیں میں گر گیا اہل خانہ نے اگرچہ جتنی بھی آہ وفغاں کی اماں نے ایک نہ سنی البتہ جب نماز سے فارغ ہوئے تو اہل خانہ نے آپ کو اس واقعہ کی اطلاع دی۔ یہ شدت توجہ اور کمال استغراق بھی منقول ہے۔

ایک بار امام سجاد گھر میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مکان کو آگ لگ گئی مگر آپ کو اس کا علم تک نہ ہوا اسی طرح جب شدت استغراق میں زیادہ اضافہ ہوتا تو اپنے بدن سے بھی آپ کی توجہ ہٹ جاتی تھی۔

اسی طرح جامع السعادات نراقی میں مروی ہے کہ امیر المومنین کے پاؤں میں تیر لگ گیا اور جراح نے جب اسے نکالنا چاہا تو حضرت کو شدید اذیت محسوس ہوئی۔ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے فرمایا: علی کو اذیت نہ دو اور جب یہ نماز میں مصروف ہوں تو ان کے پاؤں سے تیر نکال لینا۔ چنانچہ جب نماز کا وقت ہوا اور حضرت علی نے نماز شروع کی تو جراح نے آپ کے پاؤں سے تیر نکال لیا اور آپ نے اف تک نہ کی۔

یہ روایت بڑی مشہور ہے لیکن اس کی سند کچھ زیادہ معتبر نہیں ہے۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک مکمل تیر اگر جسم میں پیوست ہو تو انسان کو کسی صورت مین چین محسوس نہیں ہوتا۔اس کے لئے زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ روایت میں لفظ ''نصل'' موجود ہے جس کے معنی چھوٹے تیر کے ہیں یا یہ بھی ممکن ہے کہ تیر کا کچھ تھوڑا سا حصہ پائے مبارک میں باقی رہ گیا ہوگا جسے حالت نماز میں نکالا گیا ہوگا۔ورنہ یہ باور کرنا مشکل ہے کہ حالت نماز میں آپ کے پائے مبارک سے مکمل تیر نکالا گیا ہو اور آپ کو اس کی مطلق خبر نہ ہوئی ہو۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اگر اس مقام پر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب حضرت اتنے استغراق سے نماز پڑھتے تھے کہ ان کے پاؤں سے تیر نکال لیا گیا مگر انہیں اس کی خبر نہ وہئی تو پھر انہوں نے حالت نماز میں ایک سائل کی آواز کیسے سن لی تھی اور اسے اپنی انگشتری حالت رکوع میں کیونکر دی تھی؟

اس اشکال کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ:

ا۔ حضور قلب کے بھی مراتب ہیں۔اس کا ابتدائی مرتبہ یہ ہے کہ دل پروردگار کی طرف متوجہ ہو اور اس کے ساتھ دوسرے امور سے بھی غافل نہ ہو اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ دل مکمل طور پر حق کی طرف متوجہ ہو اور یاد حق کے علاوہ اسے کچھ بھی یاد نہ ہو۔حضرت امیر المومنین ممکن ہے کہ اس وقت حضور قلب کے

ابتدائی مرحلے پر ہوں اور اور انہوں نے سائل کی آواز کو سن لیا ہوگا۔

۲۔ حضرت کے اس عمل میں کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ آپ نے بیک وقت اللہ تعالیٰ کے دو احکام پر عمل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے بیک وقت رکوع اور زکوۃ پر عمل کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے عمل کو سراہتے ہوئے فرمایا: ویؤتون الزکوۃ وھم راکعون ''اور وہ حالت رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں۔''

آمدم برسر مطلب امیر المومنین اور ائمہ ہدیٰ پر عبادت میں ایسی کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتے تھے اور انہیں اپنی کوئی خبر نہیں رہتی تھی اور وہ ہمیشہ ہی حالت کی تمنا کیا کرتے تھے اور اس حالت کے علاوہ عام حالت وہ اپنے لئے نقص و کوتاہی تصور کرتے تھے اور اس کے لئے بارگاہ احدیت میں استغفار کیا کرتے تھے ۔ اسی لئے حضرت امیر المومنین پر حالت مناجات میں غشی کی روایات درست ہیں کیونکہ یہ غشی مشاہدہ حق کے استغراق کے نتیجے میں پیدا ہوتی تھی البتہ امام کے لئے عمومی غشی ممنوع ہے۔

قصاص خون حسین علیہ السلام

سوال: زیارت عاشورا میں دو فقرے وارد ہیں جن کی نسبتیں مختلف ہیں۔ پہلا فقرہ

جواب: زائر کی طرف سے قصاص حسین کو اپنا قصاص قرار دینے کی ایک وجہ تو وہی ہے جسے سوال میں ذکر کیا گیا ہے کیونکہ تمام شیعہ امام مظلوم سے

روحانی اتصال رکھتے ہیں۔ دراصل امام کے شیعہ حضرت کے اجزائے وجودیہ کی مانند ہیں کیونکہ حدیث میں کہا گیا ہے: سیعتنا خلقوا من فاضل طینتنا وعجنوا بماء ولایتنا۔ ''ہمارے شیعوں کی تخلیق ہماری بقیہ طینت سے ہوئی اور ہماری ولایت کے پانی سے انہیں خمیر کیا گیا۔''

امیر المومنین نے رمیلہ سے کہا تھا: جب بھی ہمارے کسی شیعہ پر مرض کا حملہ ہو یا اسے کوئی زخم لگے اور خواہ وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں ہو تو وہ زخم ہمیں اپنے وجود پر لگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

ایک شخص نے امام علی رضا سے پوچھا تھا: کبھی کبھی کسی وجہ کے بغیر میں خوشی محسوس کرتا ہوں اور کبھی کسی وجہ کے بغیر میں اپنے اندر غم محسوس کرتا ہوں اسکی کیا وجہ ہے؟

امام نے فرمایا: تمہاری خوشی اور غمی تمہارے امام کی خوشی اور غمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اسی لئے امام حسینؑ کے قتل کو ہر شیعہ اپنا قتل قرار دیتا ہے اور وہ زیارت عاشورہ میں مذکورہ جملے ادا کرتا ہے۔

اس کے علاوہ دو اور وجوہات بھی ہیں:

ا۔ عرب وعجم کے محاورات میں یہ بات رائج ہے کہ جب کسی قوم کے

سردار پر کوئی مصیبت وارد ہو تو اس کی پوری قوم کا ہر فرد یہ سمجھتا ہے کہ یہ مصیبت تنہا میرے سردار پر نہیں آئی بلکہ مجھ پر بھی آئی ہے اور اگر کسی قوم کا سردار مارا جائے تو قوم کا ہر فرد یہ کہتا ہے کہ ظالموں نے صرف سردار کو ہی نہیں مارا اس کے ساتھ انہوں نے ہمیں بھی قتل کر دیا۔

اور امام حسین جملہ اہل ایمان کے سردار ہیں اسی لئے ان کا قتل نہ فقط ان کا انفرادی قتل ہے بلکہ تمام اہل ایمان کا قتل ہے۔ اسی لئے زائر یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے آپ کو اور میرے اپنے خون کا قصاص لینے کی توفیق عنایت فرمائے۔

۲۔ اگر بنی امیہ یہ ظلم عظیم نہ کرتے اور امام مظلوم کو شہید کرنے کی جسارت نہ کرتے تو بعد میں کسی ظالم کو یہ جرات نہ ہوتی کہ وہ کسی حق کے داعی کو قتل کرے اور یوں بنی امیہ نے آپ کو شہید کر کے جملہ اہل ایمان کے قتل کا دروازہ کھول دیا اور قیامت تک جتنے بھی اہل ایمان قتل ہوں گے تو اس کا موجب بنی امیہ ہی قرار پاتے رہیں گے اسی لئے زائر اپنی زیارت میں ان الفاظ سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ آپ کا قتل صرف آپ کی ذات تک محدود نہیں رہا بلکہ آپ کی شہادت سے ہمارے قتل کا دروازہ کھول دیا گیا اور اللہ تعالیٰ مجھے یہ توفیق دے کہ میں آپ کے خون اطہر اور اپنے خون کا قصاص طلب کر سکوں۔

"ثار اللہ" کا مفہوم

سوال : مجھے ایک عیسائی کے ساتھ تثلیث کے مسئلے پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تو اس نے مجھ سے کہا: جس طرح سے تم امام حسین کو اللہ کا خون اور خون خدا کا فرزند کہتے ہو اسی طرح سے ہم حضرت مسیح کو اللہ کا فرزند کہتے ہیں۔

میں نے اس سے کہا: ایسا ہرگز نہیں ہے ہم مذکورہ الفاظ اطہار شرف اور مجاز کے طور پر کہتے ہیں جبکہ تم حضرت مسیح کو مجازا ابن اللہ نہیں کہتے۔ تم حضرت عیسیٰ کو اللہ کا حقیقی فرزند تصور کرتے ہو اور اللہ کو مجسم مانتے ہو۔

آپ سے درخواست ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی بحث فرمائیں۔

جواب: ''ثار'' کے معنی ہیں ناحق خون کا بدلہ لینا اور امام حسین کی زیارت میں ہم یہ الفاظ کہتے ہیں: السلام علیک یا ثار اللہ وابن ثارہ ''ہمارا آپ پر سلام ہو آپ کے خون اور آپ کے والد خون کا قصاص لینا اللہ کے سپرد ہے۔''

حضرت امام حسین اللہ کے عبد خاص ہیں اور خلق خدا میں انہیں اللہ سے خصوصی مقام قرب حاصل ہے اسی لئے ان کے قصاص کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی اور یہ کہا گیا: ''اس ذات کو ہمارا سلام پہنچے جس کے خون کا وارث خود خدا ہے۔''

کیونکہ امام عالی مقام کا خون صرف اس لئے بہایا گیا کہ آپ دین خداوندی کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور کلمہء توحید کی سربلندی کے خواہشمند تھے اور

قول وفعل سے کلمہ کفر کے مخالف تھے اور اسی راستے کو قائم رکھنے کے لئے آپ نے اپنی اور اپنے اصحاب کی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔

علاوہ ازیں یہ بھی ممکن ہے کہ لفظ ''ثار'' سے آپ کا بہتا ہوا خون اطہر ہی مراد ہو اور اس کی اللہ کی طرف نسبت اطہار شرف کے اعتبار سے ہو کیونکہ نسبت حقیقی تو بہر صورت محال ہے کیونکہ اللہ جسم وجسمانیات سے منزہ ہے اور یوں حضرت کے خون کی اللہ کی طرف نسبت کمال قرب کی طرف اشارہ ہو اور اس سے حضرت کی عظمت وشرف کا اظہار مقصود ہو۔ جس طرح سے مسجد کو اللہ کا گھر کہا جاتا ہے اور حضرت صالح ناقہ کو ناقۃ اللہ سے تعبیر کیا گیا، اسی طرح سے اظہار شرف کے لئے امام مظلوم کے خون کا احتساب اللہ کی طرف کیا گیا ہے۔

واضح ہوا کہ اگر لفظ ''ثار'' سے خون ہی مراد لیا جائے اور اس کی اللہ کی طرف نسبت اظہار شرف کی وجہ سے ہوگی تو یوں یہ نسبت مجازی ہوگی اور کبھی بھی حقیقی نسبت نہ ہوگی کیونکہ کائنات کا کوئی بھی فرد اس نسبت کو حقیقی تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہے جیسا کہ صفات سلبیہ میں ہی یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ اللہ اجزا سے مرکب نہیں ہے اور کوئی بھی مسلمان خون حسین کو اللہ کا جزو تسلیم نہیں کرتا۔ لہذا جب بھی کوئی مسلمان ''ثار اللہ'' کے الفاظ کہتا یا سنتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ الفاظ اپنے حقیقی معنی پر محمول نہیں ہیں بلکہ اس سے مجازی معنی مراد

ہیں جس کا مقصد صرف عظمت و شرف کا اظہار ہے۔

مسیح کسی طور بھی ابن اللہ نہیں ہیں

اور اس کے برعکس حضرت مسیح کو ابن اللہ کہنا ہر لحاظ سے غلط ہے کیونکہ مسیح کے لئے ابن اللہ کے الفاظ نہ حقیقتاً درست ہیں اور نہ ہی مجازاً درست ہیں۔ ابن کا حقیقی مفہوم یہ ہے: ''کسی شخص کے نطفہ سے پیدا ہونے والا بیٹا۔'' اور حضرت مسیح کے متعلق یہ اعتقاد رکھنا سراسر گمراہی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں رہنے والا کوئی بھی عیسائی حضرت مسیح کو حقیقی معنوں میں ابن اللہ ماننے پر تیار نہیں ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ حضرت مسیح حقیقی فرزند خدا نہیں ہیں بلکہ مجازاً فرزند خدا ہیں اور مجازی فرزند کی تعریف یہ کی جائے کہ کسی ذات کی شبیہ اور مماثل ذات کو اس کا فرزند کہا جاتا ہے اور حضرت مسیح اللہ کی شبیہ اور مماثل ہیں۔ لہذا انہیں ابن اللہ کہا جاتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

ہم کہیں گے کہ اس لحاظ سے بھی حضرت مسیح کو ابن اللہ کہنا غلط ہے کیونکہ اگر ''ابن'' سے شبیہ اور مماثل کا مفہوم مراد لیا جائے تو حضرت مسیح کسی طور پر بھی اللہ کے مشابہ نہیں ہیں کیونکہ اللہ خالق ہے اور مسیح مخلوق اور واجب ممکن میں مشابہت کیسی اور مماثلت کہاں کی؟

دنیا کوئی بھی عیسائی اس حقیقت کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسیح شکم مادر میں

قیام پذیر رہے اور حضرت مریم نے انہیں جنم دیا اور نہوں نے ان کی پرورش بھی کی اور وہ کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے بھی تھے اور ان پر وہ تمام عوارض طاری ہوتے تھے جو کسی بھی انسان پر طاری ہوتے ہیں۔جیسے کھانا، پینا، بھوک، خوشی، غم، لذت، الم، نیند، تھکاوٹ، کی مثل دیگر چیزیں۔(اسی لئے انہیں مجازا بھی ''ابن اللہ'' کہنا درست نہیں ہے۔)

اب اگر اس مقام پر کوئی عیسائی یہ کہے کہ ہم انہیں اس لئے ''ابن اللہ'' کہتے ہیں کہ دنیا میں ان کا کوئی والد نہیں تھا اور انہوں نے بہت سے معجزات دکھائے۔تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ حضرت عیسیٰؑ کا تو والد نہیں تھا اور وہ والد کے بغیر اللہ کی قدرت کاملہ سے پیدا ہوئے تو عیسائیوں نے انہیں ابن اللہ کہہ دیا جبکہ حضرت آدم کا نہ تو والد تھا اور نہ ہی والدہ تھی مگر اس کے باوجود انہیں آج تک کسی نے ابن اللہ نہیں کہا۔

اگر معجزات کی وجہ سے عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے پر بضد ہیں تو معجزات صرف ان سے ہی ظاہر نہیں ہوئے تھے دوسرے انبیائے کرام سے بھی معجزات صادر ہوئے تھے مگر ان کے پیروکاروں نے ان کے معجزات دیکھ کر بھی انہیں ابن اللہ نہیں کہا تو آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ کہنے کی کیا تک ہے؟ جبکہ انجیل میں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے آپ کو آدمی اور

فرزند آدم کہا ہے اور کسی مقام پر بھی حضرت نے اپنی عبادت کی دعوت نہیں دی ان کا تمام تر پیغام یہ تھا اللہ کی عبادت کرو۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید فرمیا: لن یستنکف المسیح ان یکون عبداللہ (النساء ۱۷۲) ''مسیح کو اللہ کا بندہ کہلانے میں کوئی شرم نہیں ہے۔''

اور اگر کوئی عیسائی یہ کہے کہ ہم مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ ان کے شرف و عظمت کے اعتبار سے کہتے ہیں تو اس کے جواب میں ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات بالکل جھوٹ ہے کیونکہ عیسائی صرف عظمت وشرف کے اظہار کے لئے مسیح کو اللہ کا بیٹا نہیں کہتے بلکہ انہوں نے اس طرح کی خود ساختہ روایات انجیل میں شامل کر رکھی ہیں جو ان کے مذکورہ بالا دعویٰ کو جھوٹا ثابت کرتی ہیں اور ان خود ساختہ روایات کا ہلکا سا نمونہ ہم یہاں پیش کرتے ہیں: ''انجیل یوحنا میں ہے کہ مسیح نے فلپس سے کہا: کیا تو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے؟ یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے، میرا یقین کرو کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں نہیں تو میرے کاموں ہی کے سبب سے میرا یقین کرو۔'' (یوحنا باب ۱۴۔ آیت ۱۰۔۱۱)

اور یوحنا کے باب دہم میں مسیح کے یہ الفاظ ہیں ''میں اور باپ ایک ہی ہیں۔'' لہذا عیسائیوں کے مذکورہ الفاظ دیکھ کر انسان اس فیصلے پر پہنچتا ہے کہ

عیسائی حضرت مسیح کو صرف اظہار شرف کے لئے ابن اللہ نہیں کہتے بلکہ جب بھی وہ ابن اللہ کے الفاظ کہتے ہیں تو اس سے حلول واتحاد مراد لیتے ہیں اور ویسے بھی اقانیم ثلاثہ (باپ، بیٹا روح القدس) کے خودساختہ نظریہ کی موجودگی میں عیسائی ابن اللہ کے الفاظ اظہار شرف کے لئے کبھی نہیں کہہ سکتے۔

اس تمام تر وضاحت سے ثابت ہوا کہ عیسائیوں کا حضرت مسیح کو ابن اللہ کہنا اور شیعوں کا امام حسین کو ثار اللہ کہنا ہرگز یکساں نہیں ہے کیونکہ ثار اللہ کے الفاظ اول وآخر مجاز پر محمول ہیں جبکہ عیسائیوں کے ابن اللہ کے الفاظ مجاز پر محمول نہیں ہیں دونوں میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔لہذا مذکورہ جملوں کو کسی بھی صورت میں مساوی قرار نہیں دیا جاسکتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو غسل کس نے دیا تھا؟

سوال: کیا امام علی رضا علیہ السلام نے اپنے والد امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو غسل دیا تھا؟ اس سلسلہ میں اگر کوئی روایت موسوم ہے تو بیان فرمائیں جبکہ مشہور یہ ہے کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام حضرت احمد بن موسیٰ کاظم نے جو کہ امام علی رضا سے بڑے تھے غسل دیا تھا۔آیا اس بات کی روایت کی تائید ہوتی ہے؟

جواب: روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ امام موسی کاظم علیہ السلام کو

سلیمان جو کہ آپ کے چچاؤں کے بیٹوں میں تھا، غسل دلایا تھا اور اس نے ہی آپ کو کفن دلایا اور اسی نے ہی آپ کو دفن کرایا تھا۔ اور امام علی رضا طے الارض کر کے بغداد تشریف لے آئے تھے اور ان تمام کاموں میں شریک تھے۔ البتہ مصلحت امامت کے تحت انہیں بغداد میں کسی نے نہیں پہچانا تھا۔

بحار الانوار کی گیارہویں جلد میں امام رضا سے واقع پر احتجاج کے ذیل میں ہے کہ علی بن حمزہ نے اپنے آپ سے عرض کیا کہ آپ کے آبائے طاہرین سے ہم نے یہ بات سنی ہے کہ امام کے امور تدفین کا متولی امام ہی ہوتا ہے۔

(مذکورہ جملے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ آپ مدینہ میں تھے جبکہ آپ کے والد وفات کے وقت بغداد میں کوئی اور ان کی تجہیز و تکفین میں آپ موجود نہ تھے تو آپ امام ہی نہیں ہیں)۔

امام علی رضا نے فرمایا: کیا حسین بن علی علیہما السلام امام تھے؟

علی بن حمزہ نہ کہا: جی ہاں وہ امام تھے۔

امام علی رضا نے فرمایا: ان کی تدفین کس نے کرائی؟

علی بن حمزہ نے کہا: ان کی تدفین ان کے فرزند علی بن الحسین نے کرائی۔

امام علی رضا نے فرمایا: مگر اس وقت تو امام زین العابدین ابن زیاد کی قید

میں تھے، وہ کربلا کیسے پہنچے؟

علی بن حمزہ نے کہا: امام سجاد اعجاز امامت سے کربلا پہنچے تھے اور ابن زیاد کو اس کا پتہ نہیں چلا تھا۔

امام علی رضا نے فرمایا: جس خدا نے امام سجاد کو کوفہ سے کربلا پہنچنے کی طاقت عطا کی تھی اسی نے دور کے صاحب الامر کو بھی بغداد پہنچنے کی طاقت عطا فرمائی تھی جبکہ امام سجاد تو قیدی تھے اور اس دور کا صاحب مر قیدی بھی نہیں ہے۔

ا۔ فرقہ واقفیہ کا یہ عقیدہ تھا کہ امام موسیٰ کاظم کی وفات ہی نہیں ہوئی وہ صرف ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوئے ہیں اور قربت قیامت کے وقت وہ ظہور کریں گے اور دنیا کو عدل وانصاف سے بھر دیں گے۔ یہ فرقہ امام علی رضا کی امامت کا منکر تھا۔ (من المترجم عفی عنہ) حضرت احمد بن موسیٰ کاظم کے فرزند اکبر ہونے کی روایت نظر قاصر سے نہیں گزری اور کتب رجال وانساب میں انہیں کہیں بھی امام ہفتم کا بڑا بیٹا لکھا گیا۔

آیت تطہیر کے مصداق کون ہیں؟

سوال:۔ سورۃ احزاب میں ارشاد خداوندی ہے:

انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا (الاحزاب ۳۳)

''اے اہلبیت! بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ تم سے ہر ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔''

برادران اہلسنت کہتے ہیں کہ اس آیت کا سیاق و سباق ازواج پیغمبر کے لئے ہے۔ اسی لئے آیت تطہیر بھی ازواج کے حق میں ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: آیت تطہیر ۳۳ویں آیت کا ایک حصہ ہے اور پوری آیت یہ ہے: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ الاولی واقمن الصلاۃ واتین الزکوۃ واطعن اللہ ورسولہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا

''اور تم اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور پہلی جاہلیت جیسا بناؤ سنگھار نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اے اہلبیت! بس اللہ کا یہی ارادہ ہے کہ وہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔''

آیت بالا دو حصوں میں منقسم ہے ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جو پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے۔''

آیت بالا دو حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ ازواج سے خطاب

پر مبنی ہے اور اس کا دوسرا حصہ اہلبیت سے خطاب پر مشتمل ہے جو حضرت محمد، علی وفاطمہ، حسن وحسین علیہم السلام ہیں (آیت کے پہلے حصے جمع مونث حاضر کی ضمیریں استعمال کی گئی ہیں۔) اور یہاں ضمیر جمع مذکر "عنکم" سے خطاب کیا گیا ہے۔

(ہاں یہ سچ ہے کہ یہ آیت ازواج کے تذکرہ کے ذیل میں وارد ہوئی ہے مگر قرآن مجید کے طالب علم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہیں کہ سیاق آیات سند نہیں ہوتیں۔ اس لئے کہ قرآن باقاعدہ کوئی تالیف وتصنیف نہیں ہے کہ اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے۔ اس میں ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں ایک تذکرہ کے وسط میں دوسرا تذکرہ شروع ہوجاتا ہے اور پھر بات پلٹ کر وہیں پہنچ جاتی ہے۔ از مترجم)

دوسری بات یہ ہے کہ آیت تطہیر کا عنوان اہلبیت ہے جو ازواج اور نساء سے مختلف عنوان ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ روایات صریحہ اور صحیحہ کے ہوتے ہوئے سیاق سے استدلال کرنا عقل ومنطق کے خلاف ہے۔

آیت تطہیر ہر چند ازواج سے خطاب سے متصل ہے لیکن یہ حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں نازل ہوئی تھی۔ صاحب غایۃ المرام نے کتب اہلسنت سے اکتالیس اور کتب شیعہ سے چونتیس روایات نقل کی ہیں اور تمام روایات کا خلاصہ یہی ہے کہ آیت تطہیر علیحدہ نازل ہوئی اور یہ اہلبیت سے مخصوص ہے جو پانچ

نفر ہیں بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں:

(صحیح مسلم ج ۲۔ق ۲۔ص ۱۱۶ طبع ۱۳۴۸ھ میں حضرت عائشہؓ زیر کساء علی اور فاطمہ اور حسنین کو جمع کر لیا تھا۔ یہی بات صحیح ترمذی اور مسند احمد میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ تفسیر طبری مین ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ جناب ام سلمہؓ نے زیر کساء آنے کی درخواست کی تو رسولؐ اکرم نے فرمایا: تمہارا انجام بخیر ہے لیکن چادر میں تمہاری گنجائش نہیں ہے۔ مترجم)

ابن صباغ مالکی نے فصول المھمہ میں اور واحدی نے اسباب النزول میں اپنی سند سے حضرت ام سلمہؓ زوجہ پیغمبرؐ اکرم سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا:

''ایک مرتبہ جبکہ رسول خدا میرے گھر میں تھے، حضرت فاطمہ ایک پتھر کی ہانڈی لے کر آئیں جس میں دودھ، گھی اور آٹے سے تیار کیا ہوا کھانا تھا۔ رسول خدا نے فرمایا: اپنے شوہر اور بیٹوں کو بلالاؤ۔ چنانچہ تمام حضرات آئے اور رسول خدا کے ساتھ بیٹھ کر کھانے لگے۔ رسول خدا اپنے گدے پر بیٹھے تھے جس کے نیچے خیبری چادر تھی اور میں اس وقت کمرے میں نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ''انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا'' کی آیت نازل فرمائی۔ رسولؐ خدا نے چادر کے حصے کو پکڑ کر ان پر چادر پھیلائی اور اپنے ہاتھوں کو آسمان کی جانب بلند کر کے کہا: پروردگار! یہ میرے اہلبیت اور خاص افراد ہیں ان سے ناپاکی کو دور رکھ اور انہیں اس طرح

سے پاک و پاکیزہ رکھ جیسا کہ پاکیزگی کا حق ہے۔اس وقت میں نے حجرے سے سر اٹھا کر کہا: یارسول اللہ! کیا میں بھی آپ کے ساتھ شامل ہوں؟ تو رسولؐ خدا نے فرمایا: تمہارے انجام بخیر ہے۔تمہارا انجام بخیر ہے۔"

ابونعیم کی روایت میں اسی طرح ہے کہ ام سلمہؑ فرماتی ہیں کہ میں نے کہا: یارسول اللہ! کیا میں اہلبیت میں نہیں ہوں؟ رسولؐ خدا نے فرمایا: تم راہ خیر پر ہو، تم ازواج پیغمبر میں ہو،

"رجس" سے معنوی نجاست اور روحانی آلودگی اور قلب کی دوسری بیماریاں مثلاً کفر، شرک، نفاق، تکبر، خود پسندی، حسد اور دیگر اخلاق رذیلہ مراد ہیں جو تنگی سینہ سے پیدا ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آیت تطہیر میں یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رجس کے جتنے بھی ارکان ہیں وہ سب کے سب اہلبیت سے دور ہیں اور رجس کی بجائے اللہ نے انہیں طہارت عطا کی ہے جس میں تمام فضائل عالیہ شامل ہیں۔اللہ نے اہلبیت کو تنگی سینہ سے محفوظ رکھا اور اس کی بجائے سینہ کی وسعت عطا کی اور روح کی بلندی عطا کی۔اللہ نے ان ذوات عالیہ کو عظمت نفس، صفائے باطن، حقیقت بینی عطا کی ہے اور انہیں ہر قسم کی آلودگی اور کج روی اور سر کجی سے محفوظ رکھا ہے اور اسی چیز کو عصمت کہا جاتا ہے اور نبوت و امامت کے لئے عصمت پہلی شرط ہے۔

(الغرض آیت تطہیر اہلبیت کی عصمت وطہارت کو ظاہر کرتی ہے اور اگر اہلسنت کی یہ بات مان لی جائے کہ اس آیت میں ازواج شامل ہیں تو خدارا ہمیں بتایا جائے کہ کیا خود اہلسنت ازواج کو معصوم مانتے ہیں؟ اور اگر کوئی شخص خواہ مخواہ کی ضد بھی کرنا چاہے اور ان کے لئے مقام عصمت کا دعویٰ کرے تو ہم کہیں گے کہ اگر ازواج معصوم تھیں تو سورۃ تحریم کی آیات کی مخاطب کون تھیں؟ مترجم)

اہلسنت میں سے اکثر علماء کا فیصلہ یہ ہے کہ آیت تطہیر خمسہ نجباء کے ساتھ مخصوص ہے البتہ عکرمہ ومقاتل ارعروہ بن زبیر جیسے افراد کا قول یہ ہے کہ آیت تطہیر ازواج پیغمبر کے حق میں نازل ہوئی۔

اس کے جواب میں ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری نظر میں عکرمہ، مقاتل اور عروہ کی روایت کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ خود اہلسنت علماء نے ان کے متعلق تصریح کی ہے کہ یہ تینوں امیر المومنین علیہ السلام کے دشمن تھے اور حضرت امیر پر تہمت ودروغ گوئی سے پرہیز نہیں کرتے تھے جبکہ مذکورہ افراد کے مقابلے میں حضرت ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ کی یہ وضاحت موجود ہے کہ پیغمبر اکرم نے آیت تطہیر میں ازواج کو شامل نہیں کیا۔

اگر اس بحث کے متعلق یہ اعتراض کیا جائے کہ یہ آیت ازواج کے

تذکرہ کے ذیل میں نازل ہوئی ہے لہذا اس سے ازواج مراد ہیں تو اس کے جواب میں ہم یہ عرض کریں گے کہ آیات کا سیاق اور نظم اس وقت حجت ہوتا ہے جب اگلے اور پچھلے جملے میں لفظی اور معنوی مغائرت نہ پائی جاتی ہو اور آیت تطہیر میں یہ دونوں فرق موجود ہیں:

۱۔ جن آیات میں ازواج کو مخاطب کیا گیا وہاں تمام تر مؤنث کے صیغے استعمال کیے گئے اور جس آیت میں اہلبیت سے خطاب کیا گیا وہاں مذکر کے صیغے استعمال کئے گئے۔

۲۔ جب تک ازواج سے خطاب جاری رہا اس میں عتاب اور تہدید موجود تھی اور جب اہلبیت سے خطاب ہوا تو اس میں شفقت و عظمت جھلکنے لگی یہ واضح فرق اس بات کی دلیل ہے کہ آیت کے شروع اور آخر کے مخاطب ایک نہیں ہیں۔

۳۔ علاوہ ازیں ستر سے زیادہ روایات صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت تطہیر پنجتن پاک کے حق میں نازل ہوئی۔ نیز ان تمام روایات کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیت تطہیر صدر آیت سے جداگانہ نازل ہوئی تھی۔

(پیغمبر اکرم آیت تطہیر کے نزول کے بعد مسلسل چھ ماہ تک ہر نماز کے وقت حضرت علی و بتول کے دروازے پر آتے تھے اور آیت تطہیر کی تلاوت کرتے تھے۔ آنحضرت نے اپنے چھ ماہ کے مسلسل عمل سے تمام اہل ایمان کو یہ درس دیا کہ مصداق تطہیر یہی گھرانہ ہے ان کے علاوہ کوئی گھرانہ تطہیر کا وارث نہیں ہے۔ مترجم)

آخرت میں زمانہ کی کیفیت کیا ہوگی

سوال نمبر۱: عالم آخرت میں زمانہ کی کیا کیفیت ہوگی؟

جواب: زمانہ اور وقت حرکت افلاک اور زمین کی سورج کے گرد گردش کرنے سے عبارت ہے آخرت میں یہ کیفیت نہ ہوگی۔ آخرت کے نور اور تاریکی کا تعلق فلک و آفتاب کی بجائے ایمان و کفر پر ہے۔ اہل ایمان جنت میں ہمیشہ اپنے ایمان کی روشنی میں اور اہل کفر دوزخ میں ہمیشہ اپنے کفر کی تاریکی میں ہوں گے۔ ہمیشگی کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟

سوال نمبر۲: جنت اور دوزخ کی ہمیشگی کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟

جواب: جنت کے حدود کی کوئی حد نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جسے جنت میں داخل کرے گا اسے جنت سے کبھی نہیں نکالے گا اور جنت اس کا ابدی ٹھکانہ ہوگی۔ جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: جزآءھم عند ربھم جنات عدن تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا۔ (البینہ ۸) ''پروردگار کے یہاں ان کی جزا وہ باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی وہ انہیں میں ہمشیہ رہنے والے ہیں۔''

اہل جنت کے لئے وقت اور زمانہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے اور اس کے برعکس جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے نکال کر جنت میں داخل کرے گا اور اسے ہمیشہ کے عذاب میں مبتلا نہیں رکھے گا

لیکن کفار اور منافقین کے عذاب کی کوئی حد نہیں ہے وہ ہمیشہ کے لئے دوزخ میں رہیں گے۔ ''وماھم بخارجین من النار'' (سورۃ بقرہ ۱۶۸) یعنی وہ دوزخ سے کبھی آزادی حاصل نہیں کرسکیں گے۔ وجعل منھم القردۃ والخنازیو. (سورۃ مائدہ آیت ۶۰) ''اور ان کو بندر اور سور بنادیا گیا۔''

اور اصحاب سبت کے بارے میں فرمایا: فقلنا لھم کونوا قردۃ خاسئین (سورۃ بقرہ آیت ۶۵) ''ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔''

ظاہر ہے کہ ''تناسخیہ'' جو کچھ کہتے ہیں یہ آیتیں ان کے خلاف جاتی ہیں کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ روح مرنے کے بعد حیوانات کے جسم میں داخل ہوتی ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جاچکا ہے اور قرآن مجید نے جو کچھ بتایا ہے وہ صورت اور ہیئت ظاہری کے تغیر سے عبارت ہے کہ جو گناہوں کی وجہ سے ان نوں پر ظہور پذیر ہوا جو شقی النفس تھے گو انسانی صورتوں میں تھے اور خداوند متعال نے انہیں اپنی قدرت سے حیوانات کی صورت میں تبدیل کردیا تھا، اس طرح کہ ان کے مسخ ہونے کے بعد ان کے اقارب آئے اور ان کو ان شکلوں میں دیکھنے پر بھی ان سب کو پہچان لیا اور مسخ شدگان نے بھی ان کو پہچان لیا۔ چنانچہ ان کے رشتہ داروں نے ان سے کہا کہ کیا تمہیں نصیحت نہیں کی گئی تھی اور منع نہیں کیا گیا تھا ؟ لیکن وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھے اور جواباً رو دیتے تھے۔

اوراس بارے میں کیثر روایات ہیں کہ جن لوگوں کو بھی خدانے مسخ فرمایا وہ تین دن سے زیادہ دنیا میں نہیں رہے اور بندر، سور اور تمام حیوانات جواب پائے جاتے ہیں وہ حیوانات کی نسل سے ہیں نہ کہ نسل مسخ شدگان سے۔ اور اس بات کی وجہ کہ ان کو ''مسوکات'' کہا شدگان جو نوع بشر سے تھے ان کو ان جانوروں کی صورت میں مسخ کیا گیا تھا اور پھر انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

قیامت کی مختلف صورتیں

مسخ اخروی کے متعلق پیغمبر اسلام اور اہلبیت طاہرین سے متعدد روایات منقول ہیں جن کا ماحصل ہے یہ کہ قیامت کے دن انسان اپنی صورت ظاہرہ کی بجائے اس صورت باطنیہ میں محشور ہوں گے جسے انہوں نے اپنی خواہش واختیار سے اپنے لئے منتخب کیا ہوگا نہ کہ دیگر جسموں میں (جیسا کہ تناسخیہ کہتے ہیں) بلکہ عین انہی جسموں میں جو ان کی نیتوں کے مطابق ہوں گے اور اس صورت میں وہ پہچانے جائیں گے کہ وہ کون ہیں اور انہوں نے کونسے عمل کئے تھے۔ بالفاظ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کی معنوی صورت ان کی ظاہری صورت پر غالب ہوگی اور اس حقیقت کا اشارہ اس آیت: ''یوم تبلی السرائر'' (طارق ۹) ''جس دن باطن آشکار کر دیا جائے گا'' میں کیا گیا ہے۔

اسی لئے گناہوں سے پرہیز کرنے والے اور اطاعت خدا بجالانے

والے افراد قیامت کے دن فرشتوں کی خوبصورتی کے ساتھ محشور ہوں گے۔

اس کے برعکس کچھ بد بخت شیاطین کی شکل وصورت میں محشور کئے جائیں گے کیونکہ انہوں نے دنیا میں شیطنت اور ابلیسیت کو قائم کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہوگی اور بعض لوگ درندوں اور جانوروں کی صورت میں محشور ہوں گے اور کچھ لوگ حشرت کی صورت میں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ونحشرھم یوم القیامۃ علی وجوھھم (بنی اسرائیل ۹۷) ''اور ہم انہیں قیامت میں ان کی اصل صورتوں کے مطابق محشور کریں گے۔''

آیت بالا کے ضمن میں بعض مفسرین نے یہ جملے لکھے ہیں: ''ای علی الحیو انات المنکسۃ الرؤوس.'': یعنی انہیں ان جانوروں کی صورت میں محشور کیا جائے گا جن کے سر جھکے ہوئے ہوں گے۔

پیغمبرؐ السلام سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: ان اللہ یحشر الناس علی نیا تھم یوم القیامۃ (بحارالانوار ج ۷۰۔ص ۲۰۹) ''اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی نیتوں کے مطابق قیامت میں محشور فرمائے گا۔''

ایک اور حدیث میں آنحضرت نے اس حقیقت کو ان الفاظ سے بیان فرمایا: یحشر الناس علی صورۃ حسن عندھا القردۃ والخنازیر فرما ''لوگ قیامت کے دن اپنی نیت اور باطن کے مطابق محشور ہوں گے اور ان کی صورتوں سے بندر اور

خنزیر کی صورت بھی بھلی معلوم ہوتی ہوگی۔'' یعنی وہ بندر اور خنزیر سے بھی بدتر صورت میں محشور ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مین فرمایا: علی یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا (نبا ۱۸) جس دن صور پھونکا جائے گا تو تم گروہ در گروہ آؤ گے۔

اس آیت مجیدہ کے ضمن میں تفسیر مجمع البیان میں آنحضرت سے یہ حدیث منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: الما یحشر عشرۃ اصناف من امتی اشتاتا قد میز ھم اللہ من المسلمین وبدل صورھم بعضھم علی صورۃ القردۃ و بعضھم علی صورۃ الخنازیر و بعضھم منکسون ارجلھم من فوق ووجوھھم من تحت ثم یسحبون علیھا و بعضھم عمی یتر ددون و بعضھم صم بکم لایعقلون و بعضھم یمضغون السنتھم فیسیل القیح من افواھھم لعابا یتقذرھم اھل الجمع و بعضھم مقطعۃ ایدیھم وارجلھم و بعضھم مصلبون علی جذوع من نار و بعضھم اشد نتنا من الجیف و بعضھم یلبسون جبابا سابغۃ من قطران لازمۃ بجلودھم فاما الذین علی صورۃ القردۃ فالقتات من الناس و اما الذین علی صورۃ الخنازیر و فاھل السحت واما المنکسون علی رووسھم فاکلۃ الربا والعمی الجائرون فی الحکم و الصم البکم المعجبون باعمالھم والذین یمضغون بالسنتھم فالعلماء والقضاۃ الذین خالف اعمالھم اقوالھم والمقطعۃ ایدیھم وارجلھم الذین یوذون الجیران والمصلبون علی جذوع من نار فالسعاۃ بالناس الی السلطان والذین اشد نتنا من الجیف

فالذین یتمتعون بالشھوات واللذات و یمنعون حق اللہ فی اموالھم والذین یلبسون الجباب فاھل الفخر والخیلاء (تفسیر مجمع البیان ج ۱۰۔ص ۲۴۳)

میری امت میں سے دس قسم کے لوگوں کو اللہ تعالی دوسرے انسانوں سے علیحدہ کرے گا اور ان کی صورتوں کو تبدیل کر کے انہیں محشور کرے گا۔ ان میں سے کچھ بندر کی شکل میں محشور ہوں گے اور کچھ خنزیر کی شکل میں محشور ہوں گے اور کچھ اس طرح سے محشور ہوں گے کہ ان کے پاؤں اوپر اور سر نیچے ہوں گے اور انہیں اس حال میں عذاب کی طرف گھسیٹا جائے گا اور کچھ اندھے ہوں گے اور ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہوں گے اور کچھ گونگے بہرے ہوں گے جنہیں کچھ شعور نہ ہوگا اور کچھ اپنی زبانوں کو چبا رہے ہوں گے اور ان کے منہ سے لعاب کی بجائے پیپ نکل رہی ہوگی جس سے تمام اہل محشر اذیت محسوس کریں گے اور بعض افراد کی بدبو مردار سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہوگی اور بعض لوگوں کو تارکول کے لمبے قمیص پہنائے جائیں گے اور بعض افراد آگ کی شاخوں پر صلیب دیئے ہوئے ہوں گے۔

۱۔ ہر بات میں نکتہ چینی کرنے والے اور چغل خور افراد بندر کی صورت میں اٹھائے جائیں گے۔

بحث معاد (قیامت)

کیا جانور اور پرندے بھی قیامت میں اٹھائے جائیں گے؟

سوال: قیامت کے دن انسانوں کا اٹھنا تو یقینی ہے۔ آیا جانور اور پرندے بھی قیامت کے دن اٹھائے جائیں گے؟ اور اس ضمن میں یہ بھی واضح کریں کہ روح باقی رہنے والی چیز ہے تو پرندوں اور جانوروں کی روح کا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟

جواب: عالم آخرت اور اس کی تفصیلات کا تعلق بنیادی طور پر مابعد الطبیعات سے ہے اور اس کے علم کا ذریعہ صرف وحی ہے اور عالم آخرت کی اطلاعات کا ماخذ قرآن مجید اور ذوات قدسیہ کی احادیث ہیں اور ان میں حیوانات وطیور کی بظاہر تفصیل نظر نہیں آتی۔ اسی لئے اس کے متعلق اجمالی اعتقاد ہی کافی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد خداوندی ہے: وَ اِذَاالْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (التکویر ۵)

''اور جس وقت جانوروں کو اکٹھا کیا جائے گا''۔

اس آیت مجیدہ کے متعلق کچھ مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت مجیدہ میں قیامت سے پہلے کا تذکرہ کیا گیا ہے اور مقصد یہ ہے کہ قیامت سے قبل جانوروں کو جنگلوں اور صحراؤں سے نکال کر ایک مقام پر جمع کیا جائے گا۔

۱۔ رزق حرام کھانے والے افراد خنزیر کی صورت میں اٹھائے جائیں گے۔

۲۔ سود خوروں کے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوں گی۔

۳۔غلط فیصلہ کرنے والے حکام اندھے بن کر محشور ہوں گے۔

۴۔اپنے اعمال پر ناز کرنے والے گونگے بہرے بنا کر اٹھائے جائیں گے۔

۵۔جن علماء اور قاضیوں کے قول وفعل میں تضاد ہوگا وہ اپنی زبانوں کو چباتے ہوئے محشور ہوں گے۔

۶۔ہمسایوں کو اذیت دینے والے لوگوں کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں گے۔

۷۔بادشاہوں کے پاس لوگوں کی چغل خوری کرنے والے افراد کو آگ کی شاخوں پر صلیب کی حالت میں محشور کیا جائے گا۔

۸۔اپنی ناجائز خواہشات ولذات کو پورا کرنے والے اور اپنے مال سے اللہ کا حق ادا نہ کرنے والے افراد اس طرح سے محشور ہوں گے کہ ان کے جسم سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہوں گے۔

۹۔تکبر کرنے والے افراد کو تارکول کی قمیص پہنا کر محشور کیا جائے گا۔

اس جیسی بہت سی روایات ہیں بحث قیامت ہماری بیان کردہ مقدار کفایت کرنے والی ہے۔

اور قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں ارشاد خداوندی ہے: **وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ۔** (الانعام ۳۸)

''اور زمین میں کوئی بھی رینگنے والا یا دونوں پروں سے پرواز کرنے والا طائر ایسا نہیں ہے جو اپنی جگہ پر تمہاری طرح کی جماعت نہ رکھتا ہو۔ ہم نے کتاب میں کسی شے کے بیان میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ اس کے بعد سب اپنے پروردگار کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔''

مذکورہ بالا دونوں آیات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حیوانات کو محشور کیا جائے گا لیکن ان کے حشر ونشر کی تفصیل اور ان کے انجام کا قرآن مجید میں کہیں تذکرہ موجود نہیں ہے اور اسی طرح سے کسی مستند روایت میں بھی اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ اسی لئے حیوانات کے محشور ہونے کا اجمالی عقیدہ ہی کافی ہے۔

علامہ مجلسی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی کتاب حق الیقین میں چند روایات نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا: آیات وروایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وحوش کو محشور کیا جائے گا اور وہ بارگاہ احدیت میں اپنے اوپر روا رکھے جانے والے ظلم وستم کی شکایت کریں گے۔ اس کے علاوہ کچھ اور جانوروں کو دیگر مصلحتوں کی وجہ سے محشور کیا جائے گا اور کچھ جانور مثلاً ناقہ صالحؑ، اصحاب کہف کا کتا، حضرت یوسفؑ کا بھیڑیا اور بلعم باعور کا گدھا جنت میں جائیں گے۔ مگر تمام جانوروں کا محشور ہونا روایات سے ثابت نہیں ہوتا۔ اسی لئے اکثر شیعہ متکلمین نے اس موضوع پر اجمالی گفتگو کی ہے اور کسی نے بھی اس کی جزئیات کا تذکرہ نہیں کیا۔

تفسیر منہج میں مذکورہ ہے کہ وحوش کو محشور کیا جائے گا اور قصاص وعوض کے بعد انہیں خاک میں ملا دیا جائے گا۔ پھر کوئی جانور عرصہ محشر میں دکھائی نہ دے گا۔

البتہ کچھ جانوروں کو بنی آدم کی خوشی کے لئے زندہ رکھا جائے گا۔ مثلاً مور اور کچھ دوسرے پرندوں کو زیبائی کی خاطر باقی رہنے دیا جائے گا مگر صحیح ترین اور مشہور قول یہ ہے کہ کوئی بھی جانور باقی نہیں رہے گا۔ البتہ ملائکہ اور جنات وشیاطین کے متعلق ثابت ہے کہ وہ محشور ہوں گے اور ملائکہ جنت میں جائیں گے اور جنات میں سے اہل ایمان جنت اور کافر دوزخ میں جائیں گے۔

البتہ سوال یہ ہے کہ جو جنات بہشت میں داخل ہوں گے تو کیا ان کو بھی بنی آدم جیسا مقام ملے گا یا کچھ فرق ہوگا۔

بعض علماء کا خیال ہے کہ انہیں جنت میں بنی آدم کی بہ نسبت پست مقام ملے گا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ انہیں جنت و دوزخ کے بیچ مقام اعراف میں ٹھہرایا جائے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ قول اول زیادہ صحیح ہے کیونکہ سورہ رحمٰن میں جنت اور نعمات جنت کے متعلق انسانوں اور جنات دونوں کو یکساں مخاطب کیا گیا ہے۔

ثواب اعمال

سوال: بعض اعمال کا بہت زیادہ ثواب بیان کیا گیا ہے۔ جسے انسانی ذہن تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور انسان یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس ثواب سے آخر استفادہ کیسے کیا جائے گا۔ مہربانی فرما کر اس مسئلے کی وضاحت فرمائیں۔

جواب: انسان بہت سی وجوہات کی بناء پر مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان میں

سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان عالم برزخ اور عالم آخرت کا اپنی اسی موجود دنیا سے موازنہ کرنے لگ جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ عالم آخرت بھی اسی عالم کی طرح سے ہے۔ اس لئے وہ عالم آخرت کی بہت سی باتوں کو حقیقت سے دور سمجھنے لگتا ہے۔ جبکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر عالم کی اپنی علحیدہ علحیدہ وسعت ہے اور ہر عالم کی وسعت و تنگی دوسرے عالم کی وسعت و تنگی کے مساوی نہیں ہے۔

اسکی مثال یوں سمجھیں کہ جو بچہ رحم مادر میں ہے اگر بالفرض اسے یہ کہا جائے کہ جس مقام پر تو موجود ہے یہ بالکل تنگ ہے اور چند روز بعد تو ایک ایسے عالم میں قدم رکھے گا کہ جو اس سے اربوں گنا بڑا ہے اور اس عالم میں تجھے رہائش کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی اور وہاں تیرا مکان اس مکان سے لاکھوں گنا وسیع ہوگا اور اس عالم میں تجھے اپنا نان ونفقہ خود تلاش کرنا ہوگا اور تجھے اپنا لباس بھی خود خریدنا پڑے گا۔ تو کیا رحم مادر میں رہائش پذیر بچے کے لئے یہ تمام تر باتیں انہونی قرار نہ پائیں گی اور کیا وہ ان تمام باتوں کو عقل سے بعید تصور نہ کرے گا؟

یقیناً وہ بچہ ان تمام باتوں کو عقل دشمنی کے تقاضوں پر محمول کرے گا کیونکہ جس دنیا میں وہ مقیم ہے وہ انتہائی تنگ ہے اور وہ اسے اپنے لئے کافی تصور کئے ہوئے ہے۔ تو کیا بچے کے اس طرح سمجھنے سے دنیا کی وسعت سمٹ جائے گی۔

ہرگز نہیں۔ دنیا کی وسعت اپنی جگہ پر قائم رہے گی۔ البتہ ہم یہ کہیں گے کہ اس

Shop No. 11
M.L. Heights
Soldier Bazar #2
KARACHI

میں اس بچے بے چارے کا بھی قصور نہیں کیونکہ اس سے وسیع و عریض دنیا کو دیکھا ہی نہیں ہے اسے تو اپنی ہی دنیا ہی بڑی نظر آ رہی ہے۔ جس طرح سے کنویں کا مینڈک سمندر کی وسعت کا تصور نہیں کر سکتا اس طرح سے اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم عالم برزخ اور عالم آخرت کی وسعت کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ مگر ہمارے تصور نہ کر سکنے کے باوجود اس کی وسعت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوگی۔ اس کی وسعت بدستور قائم و دائم رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ آج عالم طبیعات کے زندان میں محبوس افراد حیران ہو کر کہتے ہیں بہشت کے اتنے لمبے چوڑے محل اور بہشت کے کھانوں کا اتنا لمبا مینو اور شراب طہور اور اتنی کثیر حوروں سے ایک انسان کیسے استفادہ کر سکے گا۔

اس تعجب و حیرانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ ہماری روح اس جہان میں مقید ہے۔ ابھی تک اسے خود اپنی عظمت اور عالم آخرت کی وسعت کا اندازہ ہی نہیں ہے۔ اس لئے وہ عالم آخرت کی وسعت کو تعجب کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ()

"پس کسی نفس کو معلوم نہیں ہے کہ اس کے لئے کیا کیا خنکی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے"